جلد ۱۲[illegible] ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۰ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے چودہ سو سال ہو رہے ہیں، اس مدت میں عیسائی مبلغین مورخین اور مستشرقین یہ دکھانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ سفاکیوں، ہولناکیوں اور خونریزیوں سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ یہ قصائی کی دوکان نظر آتی ہے، ع:- ہیں اُن کی گفتگو کے انداز مجرمانہ،

عیسائی مسلمانوں کے خلاف یہ جارحانہ رنگ اختیار کر کے اپنی داغدار تاریخ کی مدافعت کرتے ہیں، کیونکہ درحقیقت ان ہی کی تاریخ شروع سے مذبح خانہ بنی رہی، یورپ کے فرمانروا چارلس اعظم کی فتوحات کی بڑی دھوم ہے، اس نے سیکسن، ایوار، لمبارڈ، وسطی یورپ کے جرمن قبیلوں اور شمالی اٹلی کو اپنے زیرنگیں کر کے ایک بڑی سلطنت بنائی تھی، جب سیکسن اس کے خلاف اٹھے تو اس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکسن کو تہ تیغ کیا، شمالی سیکسنی، اور نارڈل بن جن کو تباہ و برباد کرا دیا، وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر اُن کے گھروں سے نکلوایا، اور ان کو جلا وطن کیا، اس کی تفصیل کیمبرج مڈیول ہسٹری جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے، ولیم اول نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا، تو اس کے حکم سے مفتوحہ علاقے کے گھر، کھلیان، اور کھیت وغیرہ سب کچھ جلا دیئے گئے، ایک لاکھ سے زیادہ مردوں بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا، لن گارڈ نے تاریخ انگلستان جلد دوم میں لکھا ہے، کہ یارک اور درہم کے علاقے اس طرح تباہ کر دیئے گئے تھے کہ نو سال تک وہاں کی زمین کھیتی کے لائق نہیں رہی، ایڈم نے اپنی پولٹکل ہسٹری آف انگلینڈ جلد دوم میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فاتحین مفتوحین کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتے،

—— • ——

سنیٹ برتھالومیو ایک مشہور کیتھولک ولی گذرا ہے، اس کا میلہ ہر سال ۲۴ اگست کو ہوا کرتا ہے، ۱۵۷۲ء میں عین اس میلے کی رات کو فرانس کے بادشاہ چارلس نہم کے حکم سے ملک کے کل پروٹسٹنٹ قتل کر ڈالے گئے، ان کی تعداد صرف پیرس میں پانچ سو ۵۰۰ معززین اور دس ہزار عوام کی تھی یہ قتل عام تاریخ کا بڑا مشہور واقعہ ہے،

—— • ——

سترہویں صدی میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی جنگ شروع ہوئی، جو یورپ کی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہے، یورپ کی بہت سی حکومتیں اس میں الجھ کر رہ گئی تھیں، مورخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں سے صرف چھ ہزار باقی رہ گئے تھے، بویریا، فرینکونیا، اور سوابیا میں غارتگری ایسی کی گئی کہ یہ سارے علاقے قحط اور امراض سے تباہ ہو کر ویران ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی تھی اس جنگ کے بعد صرف ساٹھ لاکھ رہ گئی، اسپینیوں نے میکسیکو اور پیرو پہونچ کر جو مظالم کئے، اُن کی ہولناک تفصیل پریس کوٹ کی تاریخ میں پڑھی جا سکتی ہے، اُن کے ہاتھوں میں بائبل ہوتی، ان کی معیت میں پادری ہوتے، اور وہ مذہب کے نام پر تمام ہولناکیاں بروئے کار لاتے، جو اُن کا ذہن سوچ سکتا تھا، ڈچ ریپبلک کے مصنف موٹلے نے لکھا ہے کہ ۱۶۵۸ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے ۳۰ لاکھ باشندے سولی پر چڑھائے گئے

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں کیا کچھ نہیں ہوا، مشہور مورخ ایچ۔ جی۔ ویلس نے لکھا ہے کہ اس سوا چار سال کی جنگ میں ایک کروڑ آدمی تو میدان جنگ میں مارے گئے، دو ڈھائی کروڑ کی جانیں اس زمانہ کے مصائب میں تلف ہوئیں، کروڑوں طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرے اور اچھی غذاؤں سے محروم رہے، دوسری جنگ عظیم میں اتنی ہی جانیں ضائع ہوئیں، اور اسی

قسم کے مصائب کا سامنا رہا، عیسائیوں کے مظالم کی انتہا اس وقت دیکھنے میں آئی جب انھوں نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اس کے لاکھوں مردوں، عورتوں، بچوں، اور بوڑھوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اس طرح اتار دیئے، کہ چنگیز اور ہلاکو کی ساری سفاکیاں بھلا دی گئیں،

ویٹ نام میں امریکہ کے عیسائیوں نے تین ۳ سال تک جنگ کی، لندن کے اخبار ٹائمس کا بیان ہے کہ اس مدت میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو اڑسٹھ حملے کئے، سترلاکھ ستائیس ہزار چوراسی ٹن بم گرائے، وہاں کے نباتات کو تباہ کرنے کے لئے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن کا تباہ کن مادہ پھینکا، ۵۱۳ لاکھ ایکڑ پر زہریلی دوائیں چھڑکیں، جن کا اثر ایک سو برس تک رہیگا، ایک کروڑ افراد بے گھر ہوئے، نو لاکھ بچے یتیم، اور پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری مجروح ہوئے چھتیس ۳۶ لاکھ باسٹھ ہزار آدمی مارے گئے،

عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سفاکی دکھائی، اس پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ افریقہ، ایشیا اور دنیا کے کسی خطہ میں جاکر اپنی سامراجیت کا پرچم لہرائیں، تو اس کو ہر طرح حق بجانب ثابت کرتے ہیں، مگر یورپ میں مسلمانوں نے کسی خطہ میں اپنا قدم جمایا تو وہ اس کو کبھی گوارا نہیں کیا، سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی، اور یہاں سے بقول ڈریپر یورپ کی عقلی اور دماغی ترقی کو بڑی تقویت پہنچائی، مگر عیسائیوں کی نظروں میں اُن کی حکومت برابر کھٹکتی رہی، جب نارمن عیسائیوں نے ان پر حملہ کیا تو پلرم شہر میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کر کے گرجا گھر میں تبدیل کر دیا، وہاں علما، صوفیہ، اور حکماء کی جتنی قبریں تھیں، سب نیست و نابود کر دی گئیں، چارلس دوئم کے زمانہ میں سسلی کے مسلمانوں

کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دیدیا گیا نوسیرا اور بوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد دسی ہزار تھی، اُن کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا، ہر جگہ مسلمانوں سے خالی کرالی گئی، اس کی تفصیل ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ میں پڑھی جا سکتی ہے،

بارھویں، اور تیرھویں صدی میں یورپ کے عیسائیوں نے دو سو برس تک مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ اس لئے کی کہ اُن کو صفحۂ دہر سے نابود کر دیں، تاریخ یورپ کے مصنف اچ۔ جی گرانٹ نے لکھا ہے، کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا بیت المقدس عیسائیوں نے فتح کیا تو ایڈورڈ گبن لکھتا ہے، کہ صلیب کے علمبرداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو ان کی عبادتگاہوں میں جلایا گیا، "اُن کے فوجی سرداروں نے اس خونریزی کی خوشی میں اپنے پوپ کو لکھا کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ہم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، تو اتنا لکھ دینا کافی ہے، کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو اُن کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا،

اسپین میں مسلمان آٹھ سو برس تک رہے اور بقول موسیو لیبان اس ملک کو انھوں نے یورپ کا سرتاج بنا دیا تھا، مگر یہاں سے عیسائیوں نے ان کو جس طرح دربدر کیا اس کی تاریخ موسیو لیبان نے اس طرح لکھی ہے کہ ۱۴۹۹ء سے وہاں کے مسلمانوں پر وہ مظالم شروع ہوئے، جو ایک صدی کے اندر اُن کے اخراج کلی پر منتہی ہوئے، پہلے تو وہ بہ جبر عیسائی بنائے گئے،

پھر اس بہانہ سے کہ وہ عیسائی ہیں، وہ اس مقدس مذہبی عدالت کے سپرد کئے گئے، جس نے انھیں جہاں تک ممکن ہوا، آگ میں جلایا، پھر یہ ایک تجویز پیش کی گئی، کہ کل غیر عیسائی عرب عورتوں اور بچوں کے ساتھ قتل کر دیئے جائیں، یہ ممکن نہ ہو سکا تو یہ عام اشتہار دیا گیا، کہ سارے عرب ایک ساتھ ملک سے نکل جائیں۔ راہب بلیڈا نے بڑی خوشی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان عربوں میں سے ۳/۴ راہ میں قتل کر دیئے گئے، ایک ہی مہاجرت میں جس میں ایک لاکھ چالیس ہزار عرب افریقہ کو جا رہے تھے، ایک لاکھ مار ڈالے گئے، چند مہینے کے اندر اندلس سے دس لاکھ سے بھی زیادہ آدمی نکل گئے، اسدی نو اور اکثر مورخین اندازہ کرتے ہیں کہ فرڈی نینڈ کی فتح سے لے کر مسلمانوں کے اخراج تک اندلس سے بتیس ۳۲ لاکھ رعیت نکل گئی، ایسے قتل عام کے بعد سینت برتھالیمو کا واقعہ دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے، موسیو لیبان ہی کا بیان ہے کہ وحشی سے وحشی اور بے رحم سے بے رحم ملک گیروں نے کبھی اس قسم کے دردناک قتل عام کا دھبہ اپنے دامن پر نہیں لگایا،

۱۸۲۱ء میں یونان کے علاقہ موریا میں تین لاکھ اور یونان کے شمالی حصہ میں ہزاروں مسلمان، مرد بچے اور عورتیں بڑی بے رحمی سے ہلاک کی گئیں، تفصیل مارماڈیوک پکتھال کی کتاب دی کلچرل سائڈ آف اسلام میں پڑھی جا سکتی ہے،

خود ہندوستان کے اندر عیسائی سامراجیوں کی ہولناکیاں کم درد انگیز نہیں ہیں، سات سمندر پار کے ایک ملک سے آکر انگریزوں نے یہاں کے جائز باشندوں کو اپنی توپ تفنگ سے موت کے گھاٹ اتارا، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں نوجوان سراج الدولہ کو

شکست دے کر اس کو اسکی وراثت سے محروم کیا، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو اس کے قلعہ کے اندر گھس کر تہ تیغ کیا، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی آزادی کی خاطر سرفروشی سے کام لیا، تو ان ہی انگریزوں نے اپنی توپ و تفنگ سے ستائیس ہزار مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو لقمۂ اجل بنا دیا، دہلی کو مذبح خانہ بنا دیا گیا، نوے ۹۰ سال کے بوڑھے بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے اُن کو جلاوطن کیا، اُن کے شہزادوں میں سے مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازہ کے پاس لا کر اور اُن کے کپڑے اتروا کر بڑی سفاکی سے گولی مار دی، اُن کی لاشوں کو سربازار لٹکائے رکھا، اس کے بعد بیس ۲۰ اور شہزادوں کو پھانسی دی گئی، کیا وہ ملکہ وکٹوریہ کی مادرِ وطن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، کہ اس جرم کی سزا اُن کو دی گئی، ؟

اس بیسویں صدی میں جب جمہوریت، اخوت، مساوات، اور انسانی ہمدردی کا اعلیٰ درس دیا جانے لگا، تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکش امپائر کا نیا پاچہ کرنے کے لئے جب عیسائیوں کی فوج اناطولیہ میں ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو داخل ہوئی، تو یورپ کا مشہور مورخ ٹوائن بی لکھتا ہے، کہ یہ فوج اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی، سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں کا قتل عام شروع ہو گیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے، زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، خون کی ندیاں بہنے لگیں، ملک کی تجارت کو تباہ کر دیا گیا، مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے، جو بچ رہے، اُن کو جلاوطن کر دیا گیا،

مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں بھی لڑائیاں ہوتی رہیں، اور ان میں خونریزیاں بھی ضرور ہوئیں، مگر یورپ کے عیسائی فرمانرواؤں کی سفاکیوں اور خصوصًا دوسروں کے وطن میں جاکر وہاں کے لوگوں کو غلام بنانے کے سلسلے میں اُن کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی مفصّل تاریخ لکھی جائے تو پھر اُن کے مقابلہ میں مسلم حکمراں صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے والے، نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑانے والے اور مے توحید کا جام پلانے والے ہی نظر آئیں گے، وہ جہاں پہونچے، اس کی خاک کو اپنی جبینوں میں بسایا، اس کے ذرّے ذرّے کو سینوں سے لگایا، سات سمندر پار کے درخشندہ فلزات سے اپنے بینکوں کی عمارتوں کی تعمیر کی رعنائی اور رونق میں اضافہ نہیں کیا،

پھر دونوں میں یہ بھی فرق رہا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں اُن سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں اُن سے اور اُن کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے، عیسائیوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے، تو اس کو اپنا کرتا بھی دیدے، کیا عیسائی فرمانرواؤں نے اس پر عمل کیا؟ عمل کرنے کے بجائے وہ جہاں پہونچے، اس کو مرگھٹ اور گورستان بنا دیا، مگر اپنی تاریخ نویسی کے طلسم سامری سے اپنے سارے جرائم دوسروں خصوصًا مسلمانوں پر رکھ کر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کو ان عیارانہ تحریروں سے بے نیاز ہو کر یہ ثابت کر دکھانا ہے کہ

رہے علم و محبت کی ہمیں ہے انتہا کوئی نہیں ہر مجھ سے بڑھکر ساز فطرت میں نوا کوئی

مقالات

اسلامی ریاست کا تصوّر

از

سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن

"یہ مقالہ بمبئی کی مجلس اخوان الصفا کے ایک سمینار میں ۵ راپریل ۱۹۸۰ء کو صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں پڑھا گیا، سمینار کا موضوع "اسلام اور عصر جدید" تھا، اس کی تیاری میں دارالمصنفین کی مطبوعات سے مدد لی گئی ہے"

ہمارے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلفائے راشدین کی جو حکومت قائم ہوئی، تو اس کا مطالعہ کرنے والے کچھ تو اُس کو مذہبی، کچھ اس کو جمہوری، کچھ اُس کو دستوری، کچھ اس کو زعیمی (یعنی آمرانہ) اور کچھ اشتراکی بھی کہتے ہیں، جو جیسا ہوتا ہے، ویسا ہی اس کی تعبیر کرنے لگتا ہے، یہ مذہبی ضرور تھی مگر اوتاری یعنی تھیوکریسی نہ تھی، اس کا خلیفہ نہ خدا کا اوتار تھا، نہ خدا کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اور نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا تھا، اس میں کوئی خدائی تقدیس نہ تھی، وہ محض ایک انسان تھا، جو انتخاب کے ذریعہ سے سربراہی کے لئے مامور ہوا، مگر حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے اس کو کوئی تفوق حاصل نہ تھا، اس لحاظ سے یہ جمہوری حکومت تھی، وہ اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل و عقد سے مشورہ بھی کرتا رہتا، اس لئے اس میں دستوری حکومت کا بھی رنگ تھا، لیکن اس کے

ہر جائز حکم اور صواب دید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہوتا تھا، اس لئے وہ اپنے وقت کی قوت آمرہ بھی سمجھا جاتا، اس طرح اس حکومت میں مذہبی دستوری، جمہوری اور زعیمی کے فضائل تو ضرور تھے، مگر یہ اُن کے قبائح اور مثالب سے خالی تھی، اس لئے یہ ایک آئیڈیل حکومت قرار دی جاتی ہے، اور اس کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے، مگر ایسی حکومت تیس سال تک قائم رہی، اس کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوتی گئیں، وہ خاندانی تھیں، کیا وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں؟ اگر وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں، تو کیا مسلمانوں کی بھی حکومتیں نہ تھیں، کیا ان میں اسلامی قوانین وغیرہ رائج نہیں رہے؟ اور اگر ان میں اسلامی قوانین اور شعار کی بالادستی رہی تو پھر ان کو اسلامی حکومتیں کہا جا سکتا ہے کہ نہیں کیا وہ ہماری سیاسی تاریخ یا سیاسی ورثہ میں داخل ہیں کہ نہیں؟

اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خلفاے راشدین کا جو انتخاب ہوا تو کیا یہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت کے مطابق تھا، ظاہر ہے کہ ہمارے رسولؐ نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی، آپؐ کے یہاں حکمرانی کی ساری باتیں تو ملتی ہیں، مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپؐ نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے مگر طرز حکومت اور اس کی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لئے گذشتہ چودہ سو سال سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہو سکی، جو ہر اسلامی ملک میں یکساں طور پر مروج ہو،

اس کی وجہ بظاہر تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے، اس لئے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرز حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لئے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو، اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے، اس لئے طرز حکومت اور اسکی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے کہ

جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے، مگر حکومت کے لئے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر ماحول کے لئے لازمی ہیں، اُن کی وضاحت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہیں، جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں، جن پر فخر کیا جا سکتا ہے،

آپ کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حاکمیت پر ایمان رکھتا ہو یعنی دنیا کی سرزمین، اور اس سرزمین کا خواہ کوئی خطہ یا ملک ہو، اس کا حاکم اعلیٰ علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے، بادشاہی اسی کی ہے، قرآن پاک میں خدا اپنے کو ملک الناس، الملک القدوس السلام، الملک القدوس العزیز کہتا ہے، کلام مجید میں ہے "اللہ تعالیٰ ہی ہر سلطنت کا مالک ہے جس کو چاہے سلطنت دے" (آل عمران - ۳) اس لئے قانون اور حکم بھی اسی کا ہوا، دوسرے حکمرانوں کا حکم اسی وقت مانا جائے، جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، یا کم از کم اس کے مخالف نہ ہو، اس کے بعد کسی قیصر و کسریٰ یا کسی آمر اور مطلق العنان حاکم کے پیدا ہونے کی گنجائش نہیں رہتی، اور نہ سلطنت یا حکومت کسی کی ملکیت ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے، راعی اور رعایا کی تفریق بھی نہیں رہتی ہے، ایک شہنشاہ ارض و سما کے آگے سارے بندے یا تو اس کے خوف یا اس کی اطاعت گذاری کی خاطر سرافگندہ رہتے ہیں، یہ سرافگندگی انسانی قوانین سے پیدا نہیں ہوتی، خدا کے قوانین کو ماننے کی اس لئے بھی ضرورت ہے، کہ ان میں ابدیت ہوتی ہے، مثلاً خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ گرم چیز گرم، اور ٹھنڈی چیز ٹھنڈی رہے گی، تو کسی زمانہ میں آگ برف نہیں بن سکتی، اور برف آگ نہیں ہو سکتی ہے، خدا نے چاند اور سورج کی جو گردش مقرر کی ہے، وہ برابر رہے ہے اور برابر رہے گی، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ تو خدا کے قانون میں کوئی ادل بدل نہیں پائیگا (فتح - ۳) اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ نیکی بدی نہیں بن سکتی اور بدی نیکی نہیں کہی جا سکتی اسی طرح اس کا قانون یہ ہے کہ کسی حال میں جھوٹ نہ بولو ہمیشہ سچ بولو کسی کے ساتھ ظلم نہ کرو، دوسروں کے حقوق کو غصب کرو

چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو، دوسروں کی عزت اور آبرو کو داغ نہ لگاؤ، دوسروں کے مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل نہ کرو، حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف نہ کرو، کسی کی جائداد اور ملکیت پر ناجائز قبضہ نہ کرو، لین دین میں طرفین کی رضامندی کا خیال رکھو، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام کرو، اخلاق سوز حرکات کی بندش کرو، زمین سے فتنہ و فساد کا انسداد کرو، انکے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا خیال کرو، لوگوں کے درمیان سے نزاع اور فریب کی روک تھام کرو، یہ وہ قوانین ہیں جن میں ابدیت ہے، اور یہ سارے بندوں کے لئے بنائے گئے ہیں، چاہے کالے ہوں یا گورے، یوروپی ہوں یا ایشیائی، یا کسی مذہب کے بھی پیرو ہوں، سب کے لئے یکساں اور برابر ہیں، خود خدا کہتا ہے کہ خدا کے نافرمانوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم اللہ کا ہو جائے، (انفال - ۵)

پھر اسلام جب اس کی تعلیم دیتا ہے کہ حکومت یا اس کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے قوانین کا پابند ہو، تو اس میں کہاں سے نقص پیدا ہوتا ہے، اور کون سی ایسی چیزیں ہیں جو قابل عمل نہیں، اللہ تعالیٰ کے قوانین اس لئے ہیں کہ دنیا میں فساد نہ ہو تو پھر ان قوانین پر عمل کرنے میں کیوں پس و پیش ہو،

ہمارے رسولؐ نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت اور مذہب دو علٰحدہ چیزیں نہیں ہیں، یہ دو علٰحدہ چیزیں تو اس وقت ہو سکتیں جب حکومت کا نصب العین کچھ اور ہو، اور مذہب کا مقصد کچھ اور ہو، یہ کہا جاتا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، یہ گویا اس کی تعلیم ہے کہ قیصر اور خدا دو متوازی قوتیں ہیں، ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، یعنی اگر خدا عدل، باہمی محبت، اور انسانی ہمدردی، اخلاص اور تعلیم دے کر دنیا سے فساد مٹانا چاہتا ہے، تو کیا یہ تعلیم قیصر اور اس کی حکومت میں نہ ملے گی؟ کیا اس سے وہ خالی و عاری ہے؟

ہمارے رسول کی یہ بھی تعلیم ہے کہ حکومت کا سربراہ خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر متقی ہو، پرہیزگار ہو، اس کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت، اُن کے معاملات کی دادگری، اور اُن کے کاموں کی نگرانی ہے، تو کیا مذہب کو حکومت سے اس لئے دور رکھا جائے کہ اس کا سربراہ فاسق ہو، فاجر ہو، عیاش ہو، شرابی ہو، وہ رعایا کی خدمت، اُن کے معاملات کی دادگری، اور اُن کے کاموں کی نگرانی سے بے نیاز ہو، قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کو یہی حکم تو دیا گیا تھا، کہ اے داؤدؑ! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا، (ص ۲) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو امام یا حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا، (ترمذی ابواب الاحکام - ۲۲) قرآن پاک میں یہ بھی ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو، تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے، (نساء - ۸) قرآن پاک میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے (مائدہ - حجرات - ۲) اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، (آل عمران - ۲ - ۱۴) رسول اللہ نے فرمایا کہ جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے، اور وہ اس کی خیرخواہی پوری پوری نہ کرے، تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا" (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵ کتاب الاحکام) پھر فرماتے ہیں کہ بے شک انصاف کرنے والے حکام اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، (صحیح مسلم کتاب الامارہ) یہ بھی فرمایا کہ بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو، (ترمذی ابواب الاحکام) یہ آیتیں اور حدیثیں اسلامی حکومت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، کیا حکومت

ایسی چیزوں پر عمل کرنا پسند نہیں کرتی ہے، جو مذہب سے وحشت کھاتی ہے، پھر مذہب انسان کو اتنے حقوق دیتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ ہے سب تمھارے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس نے دریاؤں، کشتیوں اور نہروں کو تمھارے قابو میں کردیا' حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت میں پیدا کیا،

یہ ایک ایسا تصور ہے جو انسانیت کو بلند سے بلند مرتبہ تک پہنچاتا ہے، جس کے اندر سیاسی، اخلاقی، دنیاوی، اور دینی ساری باتیں ہیں، حکومت کیا انسان کو اس سے بھی بلند تر درجہ تک پہنچا سکتی ہے، جو تلقین کرتی ہے کہ حکومت اور مذہب کو الگ الگ خانے میں رکھو،

حکومت ہوتی ہے تو اس کو کسی نہ کسی موقع پر کسی سے جنگ بھی کرنی ہوتی ہے، اسلام میں لڑائیوں کے لڑنے کے جو ضوابط و قوانین مرتب کئے گئے ہیں، ان پر انسانیت فخر کرسکتی ہے'

کلام پاک میں ہے کہ زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے، (الحجرات، آیت ۹) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں اُن سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں، اُن سے اور اُن کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے، (الممتحنہ رکوع ۲) جنگ کے زمانہ یا صلح کے بعد زمینوں، فصلوں، اور نسلوں کو تباہ کردینا کسی حال میں جائز نہیں، (البقرہ ۲۰۵) دشمن اگر صلح کے لئے جھکیں تو اُن سے صلح کرلی جائے، (انفال - ۶۱)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے، تو سردار فوج کو جو احکام دیتے، ان میں ایک لازمی حکم یہ ہوتا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، (ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین،

آپ نے یہ منادی کر رکھی تھی کہ جنگ کے موقع پر جو دوسروں کے گھروں میں جاکر وہاں کے رہنے والوں کو تنگ کرے، یا لوٹ مارے، تو اس کا جہاد قبول نہیں کیا جائے گا، (ابو داؤد کتاب

کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۲) آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص محض لوٹ مار کرنے یا مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر جہاد کرتا ہے اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے، (ابو داؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب فی النہی اذا کان فی الطعام قلۃ) آپ نے مقتولوں کا سر کاٹ کر گشت کرانے یا دشمن کو گرفتار کرکے کسی چیز سے باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانے یا تلوار سے قتل کرنے کی سخت ممانعت کی (المبسوط) آپؐ نے یہ بھی ہدایت کی کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان پر احسان کیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے، ایک بار چند قیدیوں کے قتل کئے جانے کی خبر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ملی تو آپ نے فرمایا، خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا (ابو داؤد جلد ۲ ص ۱۰)

ایک بار ایک قیدی آپؐ کے پاس لایا گیا، وہ آپ کے خلاف آتشیں تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قیدی بنا کر لایا گیا تو آپؐ سے کہا گیا کہ اس کے دانت توڑ دئیے جائیں، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے دانت تڑوا دوں تو اللہ تعالیٰ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں، (سیرۃ ابن ہشام) جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے قیدیوں کو صحابیوں کے حوالے یہ کہکر کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، اُن کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو، چنانچہ صحابہ خود کھجوریں کھالیتے لیکن قیدیوں کو پورا کھانا کھلاتے حنین کی جنگ کے چھ ہزار قیدیوں کو آپ نے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے دئیے'

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ معاہدہ کا پیغام لے کر کوئی قاصد آئے، تو اُس کی جان کی پوری حفاظت کی جائے، یہ بھی فرمایا کہ دشمنوں سے معاہدہ کی پابندی ہر حال میں کی جائے، ہاں اگر دشمن معاہدہ کی خلاف ورزی کریں، تو ان کے خلاف جنگی

کارروائی کی جائے،

آپ کا یہ بھی حکم تھا کہ جب قیدی اور مفتوح علاقے کے لوگ اطاعت قبول کرلیں تو کوئی اُن پر حملہ نہ کرے بلکہ اُن کی پوری مدافعت کی جائے، اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے ان کی جان اُن کی عزت، اُن کے مال کی حفاظت کی جائے، اُن کے قافلے اور تجارت کے کارواں کو محفوظ رکھا جائے، اُن کی زمین، اُن ہی کے پاس رہے، جو چیزیں اُن کے قبضہ میں ہوں، بحال رکھی جائیں، اُن کے پادری، رہبان اور پجاری، اُن کے عہدوں سے برطرف نہ کئے جائیں' صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے، اُن سے عشر نہ لیا جائے، اُن کے حقوق زائل نہ کئے جائیں، (فتوح البلدان ص ۶۵-۵۹، مقالات شبلی جلد اول ص ۱۸۹ - ۱۸۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت کا عملی نمونہ نجران کے عیسائیوں سے حُسن سلوک کر کے پیش کیا ۸ھ میں پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیرنگیں ہوگیا، تو نجران کے عیسائیوں کو یہ حقوق دئے کہ نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، اُن کا مذہب اُن کی زمینیں، ان کے اموال، اُن کے حاضر و غائب، اُن کے قافلے، اُن کے سفرا، اُن کی عورتیں، اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، اُن کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی، اور نہ مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت کوئی راہب اپنی رہبانیت اور کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، اور جو کچھ بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے، اسی طرح رہے گا، اُن کے زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے نہ فوجی خدمت لی جائے گی، اور نہ اُن پر عشر لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج اُن کی زمین کو پامال کرے گی، اور اُن میں سے جو شخص کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، (فتوح البلدان بلاذری ص ۶ ، مطبوعہ مصر، کتاب الخراج امام

ابو یوسف) کیا اس سے بہتر جنگ و صلح کے قوانین آج کل کی اقوام متحدہ کی مجلس پیش کرسکتی ہے' یہ قرآن اور حدیث کی مذہبی ہدایات ہیں، اگر ایسی مذہبی ہدایات کو حکومت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ حکومت ایسی ہدایات پر عمل کرنا پسند نہیں کرتی، وہ چاہتی ہے کہ مذہبی احکام سے بالاتر ہو کر جنگ و صلح کے موقع پر جو چاہے کرے، نکتہ چیں مورخین مذہب کے نام پر لڑی جانے والی لڑائیوں میں بہت کچھ کیڑے نکال سکتے ہیں، مگر جمہوریت قومیت' اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام پر جو لڑائیاں لڑی گئی ہیں یا ہو رہی ہیں، اُن میں کہیں زیادہ کیڑے نکالے جاسکتے ہیں، بیسویں صدی کی جمہوری اور متمدن دنیا میں دو ایسی لڑائیاں لڑی گئیں، جو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، ان لڑائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا،

انسانی خون کا سمندر بہایا گیا، انسان لنگڑے لولے، اور اندھے ہوئے، شہروں کی عمارتیں' عبادت گاہیں اور شفاخانے تباہ ہوئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، اتنی ہی تعداد میں بچے یتیم ہوئے، دنیا میں اقتصادی بدحالی آئی، جنگ کے بعد جب صلح نامہ پر دستخط ہوئے، تو ملکوں کے حصے بخرے کئے گئے، لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہوئے، بعض ممالک کے گلوں میں سامراجیت کی غلامی کا طوق ڈالا گیا، اُن کے باشندوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک گیا، اُن کے ضمیر، زبان، مذہب کی آزادی پر پابندی عائد کی گئی، ان ملکوں کی دولت سے سامراجیت کے خزانے کو پُر کیا گیا' پھر بھی ان لڑائیوں کے فاتحوں کے کارنامے زریں قرار دے کر ان پر بے شمار کتابیں قلمبند کی جارہی ہیں،

پھر جمہوریت کے علمبرداروں، اور مذہب کو حکومت سے علیحدہ رکھنے والوں ہی نے مراکش الجزائر، شام، مصر، عراق، یمن وغیرہ کو غلام بنائے رکھا، انگلستان کو اپنی جمہوریت پر بڑا ناز ہے، لیکن ان ہی ناز کرنے والوں نے اپنے سامراجی جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر، امریکہ، کینیڈا،

ہندوستان، عدن، روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا، اور فخر کرتا رہا
کہ اس کے امپائر میں آفتاب غروب نہیں ہوتا ہے، ہالینڈ محض زر اندوزی کی خاطر انڈونیشیا
کو اپنی گرفت میں لے آیا، پرتگال اپنی آبادی کی مادی خوشحالی کے لئے ایشیا، افریقہ کے علاقوں
پر بے جا تسلط اور قبضہ جما کر اپنی توسیع پسندی پر ناز کرتا رہا، امریکہ نے جمہوریت کے نام پر .... لاکھ
ٹن سے زیادہ ہلاکت آفریں اور زہریلے بم گرائے ویٹ نام میں کمیونزم کے نام پر پچیس[۲۵] برس
تک انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی، اور اسی نام پر مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی کو جھکنے پر
مجبور کیا گیا، برلن کے بیچ شہر میں یاجوجی ماجوجی دیوار کھڑی کی گئی کہ اس شہر اور ملک کے اعزہ کو
ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے روکا جائے اور ابھی حال ہی میں افغانستان کی ایک کروڑ بارہ لاکھ کی آبادی
کے لئے ایک لاکھ فوج بھیجی گئی، اور دس لاکھ افغانیوں کو بے گھر کیا گیا،

یہ اُن حکومتوں کے کارنامے ہیں جو اسی پر یقین رکھتی ہیں، کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو،
اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اوپر کے تمام ہدیے ان قیصروں کو دیے گئے ہیں، جنھوں نے اپنے
یہاں یہ بورڈ لگا رکھا ہے کہ خدا کو بلا اجازت اندر آنے کی ممانعت ہے، آخر میں یہ کہنا ہے کہ مذہب
سے سیاست خراب نہیں ہوتی، مگر جب مذہب میں سیاست کسی مصلحت سے داخل کر دی جاتی ہے
تو مذہب اور سیاست دونوں میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں،

سیاست سے مذہب کو دور رکھ کر انسانی آبادی کو مصیبت، ہلاکت، خونریزی، قتل و غارتگری
معاشی بدحالی، اور حتی کہ معاشرتی زبون حالی اور پراگندگی سے محفوظ نہیں کیا گیا، بیسویں
صدی کی تاریخ یہی کہہ رہی ہے کہ اگر اسلام کی ان بنیادی باتوں پر جن کا ذکر اوپر کیا گیا تجزیہ
کرکے تھوڑے دنوں کے لئے دیکھا جائے، تو کیا عجب کہ انسان کی فلاح و بہبود کا سامان ہو جائے
یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مسلمانوں کے جن حکمرانوں نے اسلام کی مذکورہ بالا بنیادی باتوں پر

عمل نہیں کیا تو وہ اُن کی خاندانی یا اس علاقہ کے مسلمانوں کی حکومتیں تو ضرور ہیں مگر وہ اسلامی حکومتیں
نہیں کہی جا سکتی ہیں، اور اگر اب بھی ان بنیادی باتوں پر عمل کر کے کوئی حکومت قائم کی جاتی ہو تو اس کی نوعیت خواہ
بادشاہت کی ہو یا عوامی جمہوریت کی ہو وہ اسلامی حکومت کہی جا سکتی ہے کوئی بادشاہ ان تمام باتوں پر عمل کر کے اپنی حکومت کو
آئیڈیل بناتا ہے تو وہ جمہوریت کے ان نمائندوں سے بہتر ہے جو ظالم، فاسق، فاجر، عیاش،
شرابی، اور رند ہوں، لیکن ان کو حکومت کرنے کا حق صرف اسلئے ہو کہ وہ عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آئے ہیں،
آخر میں پھر یہ کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت کا کوئی نظام اسلامی تعلیمات پر مبنی
نہیں ہے، تو اس کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا، مولانا ابوالکلام آزاد
نے اسی بات کو اب سے ۶۰ برس پہلے اپنے موثر انداز بیان میں اس طرح کہا تھا:-

"اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولیٹکل پالیسی تیار کر لی،
کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام اُن کے ہاتھ میں ہوا، آئرلینڈ کے حکومت
طلبوں سے بھی بڑھ کر جوش اور سرگرمی پیدا کر لی، پالٹکس میں وہ از سرتاپا
غرق ہو گئے، اُن کا ہر فرد گلیڈسٹون اور مارلے ہو گیا، لیکن ساتھ ہی اگر
انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح نہ پیدا کی، اپنے تئیں
دینِ الٰہی کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا، اور خشیتِ الٰہی اور زادِ تقویٰ
سے محروم رہے تو میں اس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس میں کبھی موت در
شکست نہیں، اس بصیرتِ الٰہی کے ساتھ جس میں کبھی تزلزل اور تذبذب نہیں، از سرتاپا
صدائے ربانی بن کر لکھتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے، اور پانی ڈبوتا ہے، اگر
آفتاب مشرق سے نمودار ہوتا اور مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے، اگر مچھلی خشکی
میں اور پرندہ دریا میں نہیں رہ سکتا، اگر قوائے فطریہ اور نوامیس طبیعیہ میں،

تبدیل نہیں ہوسکتی ہے، اور اگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ نہیں بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں تو یہ کبھی نہ مٹنے والی صداقت صفحۂ کائنات پر نقش سنگ ہے کہ مسلمانوں کی یہ تمام بڑی سیاسی ہنگامہ آرائیاں تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیز اور پولٹیکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان ایک لمحہ، ایک دقیقہ، اور ایک عشر دقیقہ تک کے لئے کبھی نفع نہیں پہونچا سکے گا۔"

(الہلال ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۶۰)

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، پوری کتاب اٹھارہ ابواب میں تقسیم ہے، جن میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ، قریب قریب اسلامی دستور کے سب اصولی اور اساسی پہلو آگئے ہیں، اٹھارہواں باب غیر اسلامی نظریات سیاست سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات مثلاً شخصیت، آمریت، جمہوریت، سوشلزم وغیرہ پر مختصر مگر بہت جامع بحث کی گئی ہے۔

مؤلفہ :-

مولانا محمد اسحاق سندیلوی

ضخامت :- ۳۰۰ صفحے

قیمت :- ۱۳ روپے

منیجر

قرآنِ کریم

اور اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی

از

ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

حضرت علیؓ اور ائمۂ کرام کی طرف منسوب نسخے | حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کی طرف منسوب متعدد نسخے جو کوفی خط میں ہیں، دنیا کے اکثر کتاب خانوں اور میوزیموں میں پائے جاتے ہیں ان میں حسب ذیل ادارے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں،

اردبیل (ایران)، مشہد آستان قدس، نیشنل میوزیم تہران، کتاب خانۂ نجف اشرف، برٹش میوزیم لندن، انڈیا آفس لندن، کتاب خانۂ خطی کابل وغیرہ۔

حضرت علیؓ کے نوشتہ قرآن کا نسخہ حضرت حسنؓ کے خاندان والوں میں ابن الندیم نے دیکھا تھا، لیکن اب اس کا حال معلوم نہیں، البتہ کتاب خانوں میں ایسے قرآن کے چند خطی نسخے جن کا انتساب حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کی طرف ہے اس طرح پر ہیں،

(۱) قرآن مشہد آستان قدس شمارہ ۱/۴ ترقیمہ کتبہ علی بن ابی طالب جمادی الاول سنہ ۳۰ ہجری میں شاہ عباس صفوی نے اس کو وقف کیا، وقف نامہ بقلم بہا محمد عاملی کوفی خط، پوست آہو پر ہے، نقش و نگار، تذہیب اور اعراب و انجام و تنوین کا وجود اس کی قدامت میں

محل ہے، فہرست نگار کا خیال ہو کہ تیسری صدی ہجری سے پیشتر کا نہیں ہے، اس بنا پر حضرت علیؓ کی طرف انتساب مشکوک ہے۔

(۲) جزو قرآن منسوب بخط حضرت علیؓ، کتاب خانۂ خطی کابل،

(۳) جزو قرآن جس کا انتساب حضرت علیؓ کی طرف ہے، کتاب خانۂ خطی کابل،

(۴) یک ورق از کلام مجید بخط کوفی، ہر صفحہ ۵ سطر، ہر طرح کی تزئین سے پاک، اس کو حضرت علیؓ کی کتابت بتاتے ہیں، کتاب خانۂ سلطنتی تہران (قرآن ۲۰۷)

(۵) یک ورق از کلام کریم، کوفی خط میں، ہر صفحہ شامل ۵ سطر، بغیر تزئین، قدیم خط ہے، یہ بھی حضرت علیؓ کا خط قرار دیا جاتا ہے، کتاب خانۂ سلطنتی تہران (قرآن ۲۰۸)

(۶) قرآن زیر شمارہ ۱ کتاب خانۂ رامپور، خط کوفی منسوب بحضرت علیؓ۔

(۷) قرآن بخط کوفی، پوست آہو، یہ خط حضرت حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی طرف منسوب ہے، اور تاریخ کتابت ۴۱ ہجری درج ہے، لیکن یہ تحریر قرن سوم ہجری سے پہلے کی نہیں معلوم ہوتی، شاہ عباس نے اس کو آستان قدس مشہد کے کتاب خانے پر وقف کیا اور وقف نامہ بخط بہاء الدین محمد عاملی محفوظ ہے، (گنجینۂ قرآن زیر شمارہ ۲)

(۸) جزو قرآن منسوب بخط حضرت امام حسن بن علیؓ، کتاب خانۂ خطی کابل،

(۹) قرآن بخط کوفی نخفی منسوب بہ حضرت امام حسن بن علیؓ، کتاب خانۂ سلطنتی فہرست ص ۸، ۱۱، صفحۂ اول پر یہ تحریر ہے: "این کلام اللہ مجید بصحت رسیدہ کہ خط یکے از ائمہ اثنی عشر است و دست بدست تا پادشاہ جنت مکان رسیدہ و شہرت دارد کہ خط امام حسن علیہ السلام است..."

ایک دوسری تحریر یہ ہے: "بعضے از اہل دانش کہ در قرأت خط کوفی دانشمند بودند، نظر بہ صفحۂ آخر کما شتند چنان فہمیدند کہ این کلام در ایام خلیفۂ ثالث نوشتہ شدہ و خط امام حسن علیہ السلام است، اما بعضے آیات ظاہر و بغیر موضع باشد و ثانی در ایام خلفاء عباسی رد و بدل شدہ باشد اذن اہل مخفی دارند، فی ایام دولت محمد اولجایتو نوشتہ شد سنہ ۹۶ ۔"

ایک صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:

"ھذا الکلام فی ایام السلطان اعظم مالک ملوک العالم وارث سید المرسلین المعتصم بحبل اللہ المتین خلد اللہ ایام دولتہ آمین شہر ربیع الثانی سنہ ۷۲۱" مقابل صفحے پر "المعتصم باللہ" درج ہے،

(۱۰) جزو قرآن منسوب بحضرت حسین بن علیؓ، آستان قدس شمارہ ۱۲ خط کوفی، پوست آہو، ہر صفحہ سات سطری با اعراب و انجام، مرتب فہرست اس کو قرن سوم کا قرار دیتے ہیں،

(۱۱) جزو قرآن، ۸ ورق، خط کوفی منسوب بخط حضرت امام حسین بن علیؓ ترقیمہ "کتبہ حسین بن علی"، شاہ اسماعیل صفوی کی اس تحریر سے مزین ہے

"ھو، قد تشرفت بزیارۃ ہذا المصحف الشریف المبارک اسمٰعیل الحسینی الموسوی الصفوی بہادر خان وھی سبع و عشر و فاتر سنہ ۹۸۱"

ایک مہر بنام ھو الملک باللہ ۹۶۱، ایک اور تحریر اس طرح پر ہے:

"بتوسط جناب مرزا محمد حکیم باشی عرض دیدار شد فرمان ہمایون شرف دالاشد" (کتاب خانۂ سلطنتی قرآن ۹۹)

(۱۲) جزو قرآن، ۲۸ ورق، خط کوفی، حضرت امام حسینؓ بن علیؓ کا نوشتہ قرار دیا گیا، ترقیمہ "حسین بن علی"، شاہ اسمٰعیل صفوی کی یہ تحریر ہے:

"ھو قد تشرفت بزیارۃ ھذا المصحف الشریف المبارک اسماعیل الموسوی الحسینی الصفوی"

مہر بنام ھو الملک باللہ سنہ ۹۶۱ (کتاب خانۂ سلطنتی قرآن ۱۰۳)

(۱۳) جزو قرآن، خط کوفی، انتساب بخط علی بن حسین معروف بہ حضرت سجاد، با ترقیمہ "کتبہ المنتظر بو عدہ علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب"، ۲۶۹ ورق، ہر صفحہ ۱۶ سطر با اعراب

واعجام (گنجینۂ قرآن شمارہ ۴)

(۱۴) جزو قرآن، خط کوفی، ۶۹ ورق منتسب بہ حضرت سجاد امام زین العابدین مزین بہ تحریر ہذا: "از قرار تصدیق اہالی خبرہ و صاحبان خط و وقوف معلوم گردید کہ خط جناب ہمام حضرت سجاد امام زین العابدین ست کہ ہیچ وجہ اختلاف ندارد، بعضی بر آنند کہ خط انور جناب مستطاب اسد اللہ غالب کل غالب مطلوب کل طالب علی ابن ابی طالب است، بلاشک از دو بیرون نیست (کتاب خانۂ سلطنتی قرآن ۱۰۲)

(۱۵) قرآن شمارہ ۵ گنجینۂ قرآن مشہد، خط کوفی با اعراب و اعجام، ونقش زرین منسوب بہ علی بن موسیٰ، یہ انتساب ایک تحریر کی بنیاد پر ہوا ہے:- کتبہ علی بن موسیٰ۔

بظاہر شاہ عباس حسینی کی اپنی یادداشت سے مزین ہے، آخر میں آیت اللہ میلانی کی ۹ے۱۳ کی یادداشت ہے جس میں نسخہ کو امام علی بن موسیٰ الرضا کا خط قرار دیا ہے۔

(۱۶) دارالکتب المصریہ میں ایک قرآن (شمارہ ۱) ہے جو بعد کی ایک تحریر کی بنا پر حضرت جعفر صادق بن محمد باقر بن زین العابدین علی بن امام حسین بن علیؓ بن ابی طالب کی طرف منسوب ہے، یہ قرآن نصف اوّل بخط کوفی پوست آہو،

(۱۷) کتاب خانۂ رامپور میں قرآن شمارہ ۲ حضرت امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہے۔

(۱۸) آستانِ قدس مشہد میں قرآن (شمارہ ۲۷) کا ایک نسخہ ہے جو شاہ عباس کے ایک وقف نامہ بخط شیخ بہائی مورخہ ۱۰۰۸ ہجری کے اعتبار سے امام جعفر صادق کے خط میں ہے چند اور عبارتوں سے اسی قیاس کی تائید ہوتی ہے، مگر مرتب رہنمائے گنجینۂ قرآن اس کو اواخر قرن پنجم یا اوائل قرن ششم کا قرار دیتے ہیں۔

اس طرح کے سینکڑوں نسخے کامل یا ناتمام مختلف کتاب خانوں اور میوزیم میں محفوظ ہیں، لیکن

ان میں سے کسی ایک کو وثوق کے ساتھ کسی خاص شخصیت کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اور اتنا تو یقینی ہے کہ جو نسخے منقش و مذہب اور اعراب و اعجام والے ہیں وہ اتنے قدیم نہیں ہو سکتے اور ان کا انتساب بڑی حد تک مشتبہ ہے۔

ابن مقلہ اور ابن بوّاب کی طرف منسوب مصحف شریف کے نسخے

ابن مقلہ اور ابن بوّاب خطاطی کی دنیا میں بے پناہ شہرت کے مالک رہ چکے ہیں اور مصحف شریف کی کتابت کے سلسلے میں ان دونوں کی شہرت مسلّمہ ہے، ابن مقلہ کا پورا نام ابو علی محمد بن علی بن حسین بن مقلہ ہے، وہ ۲۷۲ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوا، رفتہ رفتہ اس نے اتنی ترقی کی کہ مقتدر خلیفہ نے اس کو وزارت پر فائز کیا لیکن ابھی دو ہی سال ہوئے تھے کہ سازش کے نتیجے میں اس کو ۳۱۸ ہجری میں قید کر دیا، بعد میں اس کا داہنا ہاتھ بھی کٹوا دیا، قید کی حالت میں ۳۲۸ ہجری میں فوت ہوا، خوش نویسی میں اس نے اتنا کمال بہم پہنچایا تھا کہ لوگ اس کے نام کو ضرب المثل پیش کرتے، فارسی ادب میں ابن مقلہ کی خطاطی کی شہرت کی روایت بہت قدیم ہے۔ سعدی کہتے ہیں۔

کاش ابن مقلہ بودی در حیات   تا بمالیدی خطش بر مقلتین

کہتے ہیں ابن مقلہ نے قرآن کے دو نسخے تیار کئے تھے،

ابن بوّاب کا نام ابوالحسن علاء الدین علی بن ہلال ہے۔ اس کی وفات ۴۱۳ھ یا ۴۲۳ھ ہجری میں ہوئی، خط ریحانی اور محقق کی ایجاد کا سہرا اس کے سر ہے، قرآن کے ۶۴ نسخے اس کی طرف منسوب ہیں، ان میں سے جو خط ریحانی میں ہے سلطان سلیم عثمانی کے پاس تھا، اس کو اس نے مسجد لالہ لی قسطنطنیہ میں ہدیہ کر دیا اور نعت نامہ و تحفہ میں مندرج روایت کے بموجب اب تک وہاں محفوظ ہے، کہتے ہیں ابن مقلہ کی تحریر کا ایسا چربہ اتارتا تھا کہ اصل سے فرق کرنا مشکل تھا، شیراز میں بہاء الدولہ کے کتاب خانے میں ابن مقلہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے ۲۹ پارے موجود تھے، تلاش کے

باوجود گم شدہ پارے کا نشان نہ ملا، ابن بواب نے خود اسکو اپنے ہاتھ سے لکھ کر بہار الدین کے سامنے پیش کیا تو وہ اس کا کمال دیکھ کر دنگ رہ گیا، اصل اور نقل میں ذرا برابر فرق نہ تھا،

ابن مقلہ[1] کی لکھی ہوئی تحریریں بہت کم ملتی ہیں، عراق کے بعض شہروں میں بعض مصاحف اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، لیکن محققین کو شبہ ہے، حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ ہرات کے میوزیم میں ابن مقلہ کا لکھا ہوا مصحف موجود ہے، اسی طرح کتاب خانہ رامپور میں بھی ایک نسخہ ابن مقلہ کا بتایا جاتا ہے، معلوم نہیں اس میں کتنی اصلیت ہے،

ربع رشیدی کے سلسلے میں رشید الدین فضل اللہ وزیر غازان خاں کا ایک خط ہے، جس میں لکھا ہے کہ اپنے گنبد کے جوار میں دائیں اور بائیں، بیت الکتب، بنایا ہے، اس میں منجملہ اور کتابوں کے ہزار نسخے قرآن عظیم کے وقف کئے گئے تھے، ان کی تفصیل اس طرح پر ہے۔

طلا سے لکھے ہوئے نسخے	۴۰۰ عدد
بخط یاقوت	۱۰ "
بخط ابن مقلہ	۲ "
بخط احمد سہروردی	۲۰ "
بخط اکابر	۲۰ "
بخط روشن خوب	۴۴۸ "
میزان	۱۰۰۰ "

گویا ابن مقلہ کے لکھے ہوئے دونوں نسخے رشید الدین فضل اللہ کے پاس موجود تھے (رک مکتوبات رشیدی ص ۲۲۶-۲۲۷)

[1] دیکھئے رسالہ ابی العباس... تحقیق پروفیسر مختار الدین احمد شائع "ندوہ نو اکر"۔

ابن بواب کے مصحف کے دو[2] نسخے اب تک موجود بتائے جاتے ہیں، ایک چسٹر بیٹی کلکشن ڈبلن آئرلینڈ میں تحت شمارہ قرآن، ۱۶، اوراق ۲۸۶، سطور ۱۵ فی صفحہ، مکتوبہ ۳۹۱ھ آخری صفحہ پر خوش رقم خاں گجراتی کی تحریر اور دستخط بقید تاریخ ۱۱۵۵ ہجری ضبط ہے، مصحف کا ترقیمہ یہ ہے: کتب ھذا الجامع علی بن ھلال بمدینۃ السلم سنۃ احدی و تسعین و ثلثمائۃ حامداً للہ تعالیٰ علی نعمہ و مصلیاً علی نبیہ محمد و آلہ مستغفراً من ذنبہ۔

دوسرا نسخہ آثار ترکیہ اسلامیہ میوزیم میں محفوظ ہے، شمارہ ۴۴۹، اوراق ۲۸۶، سطور ۲۲ فی صفحہ، خاتمہ کی عبارت یہ ہے،

کتبہٗ ابو الحسن علی بن ھلال البغدادی ابغداد دار السلم فی شہور سنۃ احدی و اربع مائۃ غفر اللہ لہ و لوالدیہ و لجمیع امۃ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ و سلم کثیراً

لیکن اس آخری نسخے کے بارے میں ڈاکٹر رئیس نے تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ اس کی نسبت ابن بواب کی طرف درست نہیں۔

دنیا کے اور دوسرے کتاب خانوں میں یاقوت مستعصمی کی طرف منسوب قرآن مجید کے نسخے پائے جاتے ہیں، منجملہ ان کے چند نسخے سالار جنگ میوزیم حیدر آباد اور ہندوستان کے دوسرے کتاب خانوں میں ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی نسبت غلط ہے،

ذیل میں خاص طور پر ایران اور مصر کے دو کتاب خانوں کی بنیاد پر آٹھویں اور نویں صدی کے چند اہم نسخوں کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، پہلے دار الکتب المصریہ پھر مشہد کے آستان قدس کے نسخوں کا ذکر ہوگا،

[2] D.S. Rice, The unique Ibn al Bawwab in The Chester Beatty Library (Dublin), 1955

(۱) ملک ناصر محمد بن قلاوون کے لئے جو قرآن لکھا گیا اس کا ایک جز، مکتوبہ ۷۱۳ ہجری دارالکتب میں محفوظ ہے جس کو سیف الدین بکتمر بن عبداللہ الساقی نے سنہ ۷۲۶ھ میں اس کتب خانے پر وقف کیا تھا، (ذیل ربعات ۷۲)

(۲) سلطان ملک ناصر محمد بن سلطان سیف الدین قلاوون کا موقوفہ نسخہ، تاریخ وقف ۷۳۰ (شمارہ ۴)

(۳) قرآن بخط حسن بن القاسم الجعفری مکتوبہ ۷۲۲ھ (شمارہ ۱۳۰)

(۴) قرآن بخط نسخ، کاتب الیاس بن محمد بن الیاس مکتوبہ ۷۳۰ھ (شمارہ ۲۲۹)

(۵) قرآن بخط ثلث، کاتب احمد بن محمد بن کمال بن یحیٰ الانصاری، مکتوبہ ۷۲۲ھ، واقف ارغون شاہ اسمٰعیل (شمارہ ۱۸۴)

(۶) مصحف بخط عبداللہ الشافعی ۷۴۰ھ (شمارہ ۱۱۱)

(۷) مصحف بقلم ثلث مکتوبہ ۷۴۳ھ (شمارہ ۱۶۲)

(۸) مصحف بخط ریحانی، کاتب احمد بن محمد بن کمال الانصاری الخطیب، کتابت ۷۴۳ھ اسی کاتب کا ایک قرآن ۷۲۲ھ کا مکتوبہ زیر شمارہ ۱۸۴ موجود ہے (شمارہ ۷۶)

(۹) قرآن بخط یعقوب بن خلیل بن محمد بن عبدالرحمن الحنفی ۷۵۵ھ، اس کو ۷۶۹ھ میں سلطان ابوالمظفر شعبان بن شریف حسین بن سلطان ناصر محمد بن منصور قلاوون نے وقف کیا تھا، واقف قرآن شمارہ ۴ کے واقف کا پوتا تھا، (شمارہ ۸)

(۱۰) مصحف بخط محمود بن حسین بن علی الخجوانی، تاریخ کتابت ۷۶۲ھ (شمارہ ۷۹)

(۱۱) قرآن موقوفہ خوند برکہ والدۂ سلطان ملک اشرف ابوالمظفر شعبان بن حسین بن ناصر بن محمد بن قلاوون، تاریخ وقف ۷۶۹ (شمارہ ۶)

(۱۲) قرآن موقوفہ ملک اشرف ابوالمظفر شعبان بن شریف حسین بن سلطان ناصر محمد بن منصور[۱] قلاوون تاریخ وقف ۷۷۰ (شمارہ ۷)

(۱۳) قرآن دوسرا نسخہ، واقف ملک اشرف ابوالمظفر شعبان مذکورۂ بالا، وقف ۷۷۰ھ (شمارہ ۹)

(۱۴) قرآن بخط علی بن محمد، کتابت ۷۷۴، واقف سلطان ابوالمظفر شعبان بن حسین تاریخ وقف ۷۷۸ ہجری (شمارہ ۱۰)

(۱۵) قرآن تقطیع کلاں، کتابت ۷۶۴ھ (شمارہ ۲۰۴)

(۱۶) مصحف، خط ریحانی، کاتب احمد بن محمود الدین، تاریخ ۷۸۹ھ (شمارہ ۵۷)

(۱۷) مصحف بحکم امیر خضر غتمش، کاتب محمد المکتب اصبہانی، تاریخ کتابت ۷۷۶ھ (شمارہ ۱۵)

(۱۸) مصحف بخط عبدالرحمٰن بن صائغ، کتابت ۸۰۱ھ، مدت کتابت ۶۰ دن (شمارہ ۱۱)

(۱۹) مصحف بخط عبدالرحمن بن صائغ، کتابت ۸۱۴ھ، برائے ملک الناصر فرج بن سلطان ظاہر برقوق (شمارہ ۱۶)

(۲۰) ربعہ قرآن، واقف امیر خضر غتمش، تاریخ وقف مذکور نہیں، اسی امیر کی نسبت سے ایک قرآن مکتوبہ ۷۷۶ھ زیر شمارہ ۱۵ مذکور ہے، (شمارہ ۶۱ ربعات)

(۲۱) قرآن مکتوبہ ۸۳۵ھ برائے ملک الناصر فرج بن برقوق (شمارہ ۱۵۲)

(۲۲) ربعہ قرآن، موقوف السلطان برقوق بدون تاریخ (ربعات، شمارہ ۱۲۰)

(۲۳) ربعہ قرآن، موقوف السلطان فرج بن برقوق، بدون تاریخ (ربعات شمارہ ۱۵۳)

(۲۴) جزو قرآن وقف السلطان برقوق بدون تاریخ (شمارہ ۷۷)

---

[۱] سلطان منصور قلاوون کی قبر قاہرہ میں ہے، نزدیک بیمارستان سفرنامہ فارسی ج ۱ ص ۳۰۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ملک مظفر یوسف بن رسول سلطان یمن کی طرف سے غلاف کعبہ آتا تھا، لیکن ملک منصور قلاوون نے بعد میں یہ سعادت حاصل کرلی۔ سفرنامۂ فارسی ص ۴۴۔

(۲۵) جزء قرآن، وقف السلطان برقوق بدون تاریخ (شمارہ ۷۸)

(۲۶) جزء قرآن، وقف سلطان فرج برقوق بدون تاریخ (شمارہ ۷۴)

(۲۷ تا ۳۳) سلطان اشرف برسباری نے اس کتاب خانے میں سات قرآن وقف کئے تھے، ان میں پہلا ۸۲۸ھ کا، دوسرا ۸۲۶ھ کا، تیسرا ۸۴۱ھ کا، چوتھا تاریخ ندارد، پانچواں اور چھٹا ۸۲۸ھ کا، ساتواں ۸۳۱ھ کا ہے، آخری تین ربعات کے ذیل میں ہے، شمارہ ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۹۹، اور پہلے چار زیر شمارہ ۹۶، ۹۳، ۹۴ اور ۹۸ موجود ہیں۔

(۳۴) مصحف بخط عبداللہ بن حجاج البرماوی سنہ ۸۴۳ھ (شمارہ ۱۴۴)

(۳۵) مصحف بخط سعد الحافظ سنہ ۸۶۰ھ (شمارہ ۳۶)

(۳۶-۳۷) خطاب بن عمر الاغاوی کی کتابت کے دو قرآن مجید دار الکتب میں محفوظ ہیں، ان میں سے پہلا ۸۷۹ھ کا مکتوبہ ہے جو کسی امیر جانی بک امیر آخور الملکی الاشرفی کے لئے لکھا گیا تھا (شمارہ ۵۵) اور دوسرا ۸۸۹ھ میں مرتب ہوا اور جس میں یاقوت مستعصمی کے خط کی پیروی ہوئی، یہ دوسرا نسخہ ملک اشرف ابی النصر قایتبای نے ۱۹ محرم ۸۹۰ھ کو وقف کیا تھا، (شمارہ ۱۲۶)

(۳۸ تا ۴۲) سلطان قایتبای چرکسی کے چار موقوفہ نسخے اور موجود ہیں۔

وقف ۸۷۹ (شمارہ ۸۵)

وقف ۸۵۷ (شمارہ ۱۰۱ ربعات)

وقف ۵ صفر ۸۸۰ھ (شمارہ ۱۴۳)

وقف بدون تاریخ (شمارہ ۸۸ - الاجزا)

(۴۳) قرآن، خط ثلث و نسخ، الکاتب علی بن ابی قاسم بن رستم الوفاعی، سنہ کتابت ۸۸۵ھ،

دار الکتب میں محفوظ نسخوں کے ذکر کے بعد اب آستان قدس وغیرہ کے نسخوں کا مختصر تعارف

پیش کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے یہ نسخے آٹھویں اور نویں صدی کے ہیں۔

ذیل میں چند نسخوں کا تعارف کرایا جاتا ہے جو تاریخی لحاظ سے کافی اہم ہیں۔

(۱) قرآن کے دو ورق، خط کوفی میں پوست آہو، جس پر ایک عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآن کو محمد بن ابراہیم بن افلح العطار نے ۲۷۰ ہجری میں دمشق کی جامع مسجد کے لئے وقف کیا تھا، واضح ہے کہ اس تاریخ سے قبل کا نوشتہ ہوگا۔ یہ نسخہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔

(۲) قرآن کا ایک نسخہ جامع دمشق میں ہے جو بقول دکتور صلاح الدین منجد، ۲۶۷ ہجری کا مکتوبہ ہے، اس کا خط کوفی تزیینی ہے۔

(۳) گنجینۂ قرآن مشہد ایک قرآن مکشوف ہوا ہے جس کی کتابت ۳۲۷ ہجری میں اصفہان میں ہوئی تھی، یہ خط معقلی میں ہے اور ایران کا قدیم ترین نسخۂ قرآن ہے۔

(۴) مشہد ہی میں قرآن کا ایک جزء خط کوفی آمیختہ بہ نسخ میں ہے۔ اس کو محمود غزنوی کے ابوالقاسم منصور بن محمد بن کثیر نے ۳۹۳ ہجری میں آستان قدس کے لئے وقف کیا، وقف نامہ اس طرح ہے،

"سبلہ ابوالقاسم منصور بن محمد بن کثیر علی المشہد بطوس فی شہر ربیع الاول سنۃ ثلاث و تسعین و ثلاث مائۃ ابتغاءً لوجہ اللہ وطلباً لمرضاتہ لا یباع ولا یوھب ولا یورث غفر اللہ لہ ولوالدیہ"۔

ابوالقاسم منصور[1] بن ابی الحسین محمد بن ابی منصور کثیر بن احمد ہرات میں پیدا ہوا، اس کا جد امجد قائن (خراسان) سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کا باپ ابوالحسین[2] محمد سامانیوں کے دور میں وزارت کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا، عربی کے شاعر عجمی[3] نے اس کی مدح میں اشعار لکھے ہیں،

---

[1] اس کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ بیہقی، حواشی فیاض ص ۱، ۴، ۹۴، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۸۲-۱۸۴، ۳۶۲، ۳۶۴، ۳۸۸-۳۸۹، ۶۰۰، ۶۶۱، ۶۶۴ وغیرہ۔

[2] دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۲۰۶

ابوالقاسم منصور سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں وزیر اور دیوان عرض تھا، اور سلطان مسعود غزنوی کے زمانے میں اسی طرح محترم و معزز رہا، پہلے دیوان عرض تھا اور پھر خراسان کا صاحب دیوان ہوگیا۔ اس کا شمار مسعود غزنوی کے چند محترم ترین امرا میں تھا جیسا کہ بیہقی کی اس عبارت سے ظاہر ہے:۔

"انجام دی باید محتشم و بوالقاسم کثیر از ہرات بیامدہ است و نام دارد، و بوسہل حمدوی نیز مردی محتشم و کافی است، و بوسہل زوزنی ہم محتشم دراز کشید و بندۂ خداوند است و ہم نامی دارد، و عبدوس نیز نام و جاہ یافت، این اند محتشم تر بندگان خداوند کہ بندہ نام برد" (چاپ فیاض ص ۳۸۸)

اس کی تاریخ وفات نہیں معلوم لیکن ۴۳۲ھ تک وہ زندہ تھا۔ (تاریخ بیہقی ص ۶۶۴)

(۵) آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں ایک دوسرا نسخہ موجود ہے، اس کو ابوالحسن عراقی دبیر سلطان مسعود غزنوی نے آستان قدس پر وقف کیا ہے، یہ نسخہ نسخ متمایل بہ ثلث میں ہے، تاریخ بیہقی میں ہے :۔ "و عراقی دبیر بوالحسن ہرچند نام کفایت بر وی بود خود بدیوان کم نشستی و بیشتر پیش امیر بودی و کارہای دیگر راندی و محلی تمام داشت در مجلس این پادشاہ" (ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

ابوالحسن عراقی کی وفات ۲ شعبان ۴۲۹ ہجری کو ہوئی، وہ مشہد میں امام رضا کے روضہ میں دفن ہوا، امام رضا کے روضہ سے اس کی وابستگی کا ذکر بیہقی نے اپنی تاریخ میں اس طرح پر کیا ہے،

بیہقی ۲ئ لغت نامہ دہخدا، اور رہنمای گنجینہ کتاب میں اصمعی شاعر لکھا ہے جو غلط ہے، اسلئے کہ اصمعی ۲۱۶ھ میں وفات پا چکا ہے یعنی تقریباً ڈھائی سو سال پہلے، منوچہری نے ایک مشہور قصیدہ اسکی مدح میں لکھا ہے، مطلع یہ ہے،

نوروز فرخ آمد و نغز آمد و شہیر	با طالع مبارک و با کوکب منیر
مرغان دعا کنند بگل بر اسپیدہ دم	بر جان و زندگانی بوالقاسم کثیر

دیوان چاپ سیاقی ص ۴۴،

"و روز دوشنبہ ششم بوالحسن عراقی دبیر گذشتہ شد رحمۃ اللہ علیہ، و چنان گفتند کہ زنان او را دارو دادند کہ زن مطربۂ مرغزی را بزنی کردہ بود، و مرد سخت بخرد بود و باریک گیر، ندانم کہ حال چون بود، و در آن ہفتہ کہ گذشتہ شد من بعیادت او رفتہ بودم او را یافتم چون تار موی گداختہ ولیکن سخت ہوشیار گفت و وصیت بکرد تا تابوتش بمشہد علی موسی الرضا رضوان اللہ علیہ بردند بطوس، و آنجا دفن کردند کہ مال این کار را در حیات خود بدادہ بود و کاریز مشہد را کہ خشک شدہ بود باز روان کردہ و کاروان سرای برآوردہ و دہی مستغل بیک خراج بر کاروان سرای و بکاریز وقف کردہ، و من در سنہ احدی و ثلاثین (واربع مایۃ) کہ بطوس رفتم با رایت منصور، پیش کہ ہزیمت دندانقان افتاد و بنوقان رفتم و تربت رضا را رضی اللہ عنہ زیارت کردم، گور عراقی را دیدم در مسجد آنجا کہ مشہد است در طاقی پنج گز از زمین تا طاق، و او را زیارت کردم و تعجب ماندم از حال این دنیای فریبندہ کہ در ہشت و نہ سال این مرد را بر کشید و بر آسمان جاہ رسانید و بدین زودی بر دو ناچیز گشت" (ص ۵۳۹)

(۶) آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں قرآن کا ایک حصہ (۴۵ ورق) محفوظ ہے، یہ خط کوفی میں ہے اور کاتب ابوالبرکات ہے، سنہ کتابت درج نہیں البتہ تاریخ وقف ۴۲۱ ہجری موجود ہے، اس نسخے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قرآن کا نسخہ آستان قدس میں ابوعلی بن حسولہ کے ذریعے وقف ہوا تھا جیسا کہ ذیل کی عبارت سے واضح ہے،

"وقف موبد و سبیل مخلد وقفہ و سبلہ کاتبہ ابوالبرکات علی مشہد الامام ابی الحسن علی بن موسی الرضا

۱؎ واضح ہو کہ دہ غزنین میں مرا ہے۔ ۲؎ اس کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۵۸، ۹۴، ۴۰۱، ۴۱۶، ۴۰۵، ۴۱۴، ۴۳۴، ۴۴۴، ۴۴۷، ۴۵۷، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۸، ۴۷۰، ۴۷۲، ۴۷۷، ۴۹۷، ۴۹۸، ۵۰۰، ۵۱۸، ۵۲۰، ۵۲۹،

علیہ السلام ابتغاءً لمرضات اللہ عزوجل وطلباً لثوابہ وسلمہ ابو علی بن حسولہ علی ان یکون فی یدہ لایخرج من البقعۃ والمسجد وذالک فی شہر رمضان سنہ احدی وعشرین واربعمایۃ

ابو علی بن حسولہ کے دو معاصر یعنی ابو منصور ثعالبی اور باخرزی نے تتمۃ الیتیمہ اور دمیۃ القصر میں (علی الترتیب) اس کے حالات لکھے ہیں، وہ مدت تک مجد الدولہ دیلمی کا صاحب دیوان رسائل رہا تھا، ۴۲۰ ہجری میں جب سلطان محمود نے رے پر قبضہ کیا تو ابو علی کو اپنے ساتھ غزنین لایا اور اس کو اپنا وزیر مقرر کیا، سلطان مسعود کے زمانے میں رے کے دیوان رسائل اس کے سپرد تھے، اسکی وفات ۴۵۰ ہجری میں بتائی گئی ہے،

(۷) گنجینۂ مشہد کا ایک نسخہ جس کو محمد بن موسیٰ نے ۴۰۲ ہجری میں آستانۂ قدس پر وقف کیا تھا، اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ خط نسخ میں ہے اور کوفی کے اثر سے پاک ہے، یہ نسخہ راہنمای گنجینہ میں شامل نہیں،

(۸) جزو قرآن دار الکتب المصریہ شمارہ ۴۴ بخط ابی علی محمد بن مقلہ (م: ۳۲۸) سال کتابت ۳۰۸، اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی ترجمہ شامل ہے، اور بظاہر قرآن کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ ہے جو مکشوف ہوا ہے، اگرچہ متعدد قرآن دنیا کے کتاب خانے میں اسکے نام سے منسوب ہیں لیکن ایک قول کے مطابق اس نے صرف دو قرآن یادگار چھوڑے ہیں (ارک، نمت نامہ ص ۳۵۴)

(۹) جزو قرآن، گنجینۂ قرآن مشہد، خط کوفی مشکول، تاریخ تحریر وتذہیب ۴۶۶ ہجری، کاتب ومذہب عثمان بن حسین وراق، علی بن ابی الفضل نے ربیع الآخر سنہ ۶۱۴ میں مشہد کے روضہ پر وقف کیا ہے،

(۱۰) قرآن بخط وتذہیب محمد بن عثمان وراق (خط کوفی تزئینی) موقوف ۴۱۶ ھ

(۱۱) جزو قرآن، بخط عبد الملک بن عبد اللہ بن احمد زکریا الزاہد اصفہانی، سال کتابت ۴۶۹، دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے،

(۱۲) قرآن سال کتابت ۵۰۵ ہجری، بست افغان نیشنل لائبریری پیرس خط کوفی تزئینی،

(۱۳) قرآن بخط کوفی برآموز، محفوظ چیسٹر بیٹی کلکشن،

(۱۴) جزو قرآن بخط کوفی تزئینی، کاتب وسنہ کتابت ندارد، لیکن ورق اوّل پر ایک تحریر ہے جو ۵۴۶ھ میں لکھی گئی، انداز خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوائل قرن پنجم کی تحریر ہوگی، روضۂ مشہد پر وقف ہے،

(۱۵) جزو قرآن بخط کوفی تزئینی، کاتب ابو القاسم حسن بن حسین بن احمد ابن علی خطیب، تاریخ تحریر شوال ۵۳۵ ہجری، اور اسی سال جمال الدین حاجی علی بن اسماعیل نے روضۂ مشہد پر وقف کر دیا تھا،

(۱۶) جزو قرآن، کاتب مسعود بن احمد الکاتب الاصفہانی، تاریخ کتابت ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۵۵۵ھ، دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے،

(۱۷) جزو قرآن بخط کوفی تزئینی، کاتب محمد بن حسین، تاریخ تحریر غرۂ جمادی الآخر ۵۶۵ ہجری، راہنمای گنجینۂ قرآن شمارہ ۲۲۔

(۱۸) نسخۂ قرآن بخط کوفی، کاتب ومذہب بکر بن احمد بن عبید اللہ الغزنوی، تاریخ کتابت اوّل رمضان سنہ ۵۶۶، دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے، یہ نسخہ اپنے خط وتذہیب کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

(۱۹) قرآن خط کوفی دورۂ تکامل، با اعراب واعجام ومد وتشدید، کاتب احمد بن علی المقری الیوقصابادی، کتابت ۵۰۳، مذہب محمد بن عبد الرحمن بن محمد الفرج الدامغانی، نسخۂ گنجینۂ قرآن

آستان قدس مشہد میں محفوظ ہے ،

(۲۰) خط مغربی میں پوست آہو پر ایک نسخۂ قرآن دار الکتب المصریہ میں موجود ہے (شمارہ ۱۹۶) اس کا کاتب عبد اللہ بن محمد بن علی ہے جس نے شہر بلنسیہ میں ۵۷۰ ہجری میں اس کی کتابت وزیر ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن بن عبد اللہ المزحجی ثم اللوشی کے لئے کی تھی ،

(۲۱) دار الکتب المصریہ میں ایک نسخۂ قرآن بخط ریحانی (شمارہ ۲) کاتب عبد الرحمن بن محمد بن ابی الفتح ہے ، یہ نسخہ ۵۹۹ ہجری اتابک ابو بکر بن ابو المظفر سعد بن زنگی کے لئے لکھا گیا ہے ، یہ بادشاہ وہی ہے جس کے دربار سے مشہور فارسی شاعر سعدی شیرازی منسلک تھے ۔ لیکن اس سلسلے میں دشواری یہ ہے کہ ابو بکر ۶۲۳ میں تخت نشین ہوا ہے ، ۵۹۹ھ میں اس کا باپ ابو المظفر سعد بن زنگی فرماں روائے فارس تھا ،

(۲۲) دار الکتب میں ایک دوسرا نسخۂ قرآن مسعود بن محمد بن مسعود خطاط اصفہانی کے خط میں ہے ، (شمارہ ۱۴۲) جس کی کتابت پنجم ذی قعدہ ۶۰۷ ہجری میں ہوئی ، اس کے ساتھ ترجمۂ فارسی بھی شامل ہے ، اسی کاتب کا ایک اور نسخۂ قرآن اسی کتاب خانے میں موجود ہے جو ۵۵۵ھ میں لکھا گیا ہے ، گویا ۵۲ سال پہلے ، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتب نے لمبی عمر پائی تھی ، پہلا نسخہ اوائل عمر کا اور دوسرا اواخر کا ہے ۔

(۲۳) قرآن مجید کا ایک نسخہ خط کوفی میں گنجینہ قرآن مشہد (شمارہ ۳۱۳) میں ہے ، اس کا کاتب ابو الحسن علی بن محمد بن محمد اور سنہ کتابت رمضان ۶۲۰ ہجری ہے ، یہ نسخہ اپنے خط کی پختگی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے ، محمد رضا استرآبادی نے ۱۰۱۱ ہجری میں روضۂ مشہد پر وقف کیا تھا ،

(۲۴) دار الکتب المصریہ (شمارہ ۳۳) میں ایک نسخۂ قرآن ۶۳۵ ہجری کا مکتوبہ ہے ، اس کا کاتب اسمٰعیل بن ابراہیم بن احمد اور خط ریحان ہے ،

(۲۵) برٹش میوزیم میں قرآن مجید کا ایک نسخہ خط مغربی میں ہے ، اس کی کتابت ۶۵۲ ہجری کے قبل ہوئی تھی ، اس نسخے پر مالک نسخہ کے لڑکے کی پیدائش کی یہ تاریخ درج ہے ، مخطوط نمبر ۶۴ ۔

اب ذیل میں یاقوت مستعصمی کی کتابت کے نسخوں کی بابت ایک مختصر یادداشت پیش کی جاتی ہے ، یاقوت ۶۱۸ھ کے قریب پیدا ہوا اور ۶۹۸ھ میں وفات پائی ، اس کا نام جمال الدین ابو المجد عبد اللہ تھا ، مستعصم باللہ (۶۴۰ ـ ۶۵۶) کے زمانے میں اس کی بڑی ترقی ہوئی ، وہ عالم و فاضل اور اعلیٰ درجہ کا خطاط تھا اور خطوط ستہ یعنی ثلث ، محقق ، توقیع ، ریحان ، رقاع ، نسخ کو ماہرانہ استادی سے لکھتا تھا ، اس کے نام سے قرآن مجید کے متعدد نسخے دنیا کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں ، ان میں بعض یہ ہیں ۔

کتاب خانہ ایا صوفیہ ترکی ۶۵۳ ، کتاب خانہ حمیدیہ قسطنطنیہ (۶۶۲)
کتاب خانۂ سلطنتی تہران ۶۶۸ ، کتاب خانہ آستان قدس ۶۷۴
موزۂ ایران باستان ۶۷۸ ، کتاب خانۂ ملی ملک ۶۸۰
مجموعۂ مخطوطات بیتیل ۶۸۱ ، کتاب خانہ نور الدین مصطفیٰ ایک ترکی ۶۸۲
مقبرۂ سلطان سلیم عثمانی ۶۸۴ ، کتاب خانہ آستان قدس ۶۸۶
کتاب خانہ ملی پیرس ۶۸۹ ، دار الکتب المصریہ ۶۸۹
کتاب خانہ ملی پیرس ۶۹۰ ، دار الکتب المصریہ ۶۹۰

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستعصمی نے ایک ایک سال میں دو دو نسخے لکھے ہیں جو ذرا مشکل سے قیاس کیا جا سکتا ہے ، ظاہر ہے کہ قرآن کے نسخوں کے سلسلے میں جعل کیا گیا ہے ، اس قسم کے متعدد واقعات موجود ہیں خود یاقوت مستعصمی کی طرف دو نسخے منسوب ہیں ، ان میں آستانِ قدس مشہد کا ایک نسخہ ۶۰۴ کا مکتوبہ ہے یعنی کاتب کی پیدائش سے ۱۴ سال قبل کا ہے ، دوسرا نسخہ

کتاب خانہ سلطنتی تہران کا ہے جو ۶۳۰ کا نوشتہ ہے، اس تاریخ میں مستعصمی کی عمر ۱۲ سال کی ہوگی، اتنی کم عمری میں اس نسخہ کی کتابت مشکل سے تسلیم کی جاسکتی ہے،

(۱) قاضی محمد احسن قریشی جلالپور پیر والا کے مجموعہ میں قرآن کا ایک مطلا نسخہ ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۷۸۰ھ) کا مکتوبہ قرار دیا گیا ہے، کہتے ہیں مخدوم کے ہاتھ کا ایک دوسرا نسخہ سجادہ نشین صاحب اوچ بخاری کے پاس ہے، (سیارہ ڈائجسٹ ص ۸۶، کالم ۲)

(۲) آستان قدس مشہد میں عبداللہ صیرفی تبریزی کے ہاتھ کا ایک نسخۂ قرآن ہے (شمارہ ۷۴) یہ خط نسخ میں اور تاریخ کتابت ۷۲۰ھ ہے، عبداللہ صیرفی اپنے عہد کا مشہور خطاط تھا اور ایک رسالہ رسالۃ الخط کا مؤلف ہے، رسالۃ الخط کا ایک نسخہ کتاب خانہ آستان قدس میں موجود ہے (رک فہرست ج ۷، ص ۴۵۷)

(۳) آستان قدس کے کتاب خانے میں قرآن مجید کا ایک نسخہ بخط محمد بن شیخ یوسف الابازی معروف بہ سید الخطاط موجود ہے، اس کی کتابت ۷۳۷ ہجری میں ہوئی، خط عربی شیوۂ ترکستانی ہے، متن کے ساتھ ترجمہ و تفسیر ترکی بھی ہے، (قرآن شمارہ ۴۸۵)

(۴) جزو قرآن بخط ثلث کاتب شیخ محمد طغرائی، تاریخ تحریر ۸۰۹ ہجری، مشہد آستان قدس (شمارہ ۵۸)

(۵) بایسنقر بن شاہ رخ (م: ۸۳۷) کے زمانے میں خطاطی کو ترقی ملی ہے، وہ خود خطاط تھا، چنانچہ آستان قدس مشہد میں اس کے نوشتہ قرآن کے سات ورق اور چھ ورق طالار گنجینہ اور ایک ورق موزۂ آستان قدس میں موجود ہیں،

(۶) بایسنقر مرزا کا بھائی ابراہیم سلطان فاضل اور خطاط تھا، اس نے ایک قرآن مجید ۸۲۷ میں مرتب کرکے آستان قدس مشہد پر وقف کردیا تھا اس میں سے اب صرف ۱۴ ورق

رہ گئے ہیں، یہ خط ثلث کا بہترین نمونہ ہے، قرآن مجید کا ایک نسخہ ابراہیم سلطان کی طرف منسوب ہے جس کی کتابت ۸۳۷ میں ہوئی لیکن مرتب رہنمای گنجینۂ قرآن مشہد کا خیال ہے کہ یہ نسخہ جعلی ہے، اس کا خط ابراہیم سلطان کے خط سے متفاوت ہے، یہ آخری نسخہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰) شاہ بیگم حبیبۂ عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۰ - ۱۰۸۳) کے کتاب خانے میں اور خواجہ ہلال کی تحویل میں رہ چکا ہے، اور سید علی الحسینی مرید عالمگیر بادشاہ کی مہر سے مزین ہے، (قرآن شمارہ ۶۲)

(۷) عبداللہ طباخ ہروی شاہ رخ بن تیمور کے دور کا مشہور خطاط تھا، اس نے ۸۴۵ ہجری میں رکن السلطنت علاء الدولہ بہادر خاں کے مشورے سے ایک قرآن سلطان حسین بیقرا کے خزانے کے لئے لکھا تھا، اس کا یہ نسخہ مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے فرزند اعتقاد خاں نے آستان قدس مشہد پر وقف کیا، ایک مہر ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں :- مرید خاص بادشاہ جہاں اعتقاد خاں (قرآن شمارہ ۶۳)

(۸) محمود سلطانی مکتب ہرات کا خطاط گذرا ہے، اس نے یاقوت مستعصمی کے خط کی ہو بہو نقل ایک کلام مجید میں کی ہے جو ۸۴۶ میں مکمل ہوا، یہ نسخہ کتاب خانہ سلطنتی (قرآن شمارہ ۲۵) میں محفوظ ہے،

(۹) زین العابدین بن محمد کاتب شیرازی نے جمادی الاولیٰ ۸۷۶ ہجری میں ایک قرآن مجید ابوالفتح مظفر الدین حسن بہادر خاں کے لیے لکھا تھا، اس نسخہ کی اہمیت اس طرح پر اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ نور الدین جہانگیر بادشاہ کی ملک میں تھا اور اس نے آستان قدس مشہد کے کتاب خانے پر وقف کیا تھا، یہ قرآن شامل ترجمہ فارسی ہے، ترجمہ خط نسخ اور متن خط ثلث میں ہے (قرآن شمارہ ۴۶)

سطور بالا میں قرآن مجید کے صرف اہم تاریخی نسخوں سے بحث کی گئی ہے حالانکہ اس کی

تزئین وتہذیب پر جتنی محنت و فنکارانہ بصیرت صرف کی گئی ہے اور ایسے ایسے اعلیٰ نمونے کے قرآن کے نسخے مرتب ہوئے ہیں کہ ان کی بنا پر خطاطی و خوشنویسی مصوری سے کم دل کش نہیں رہ جاتی، یہ فن جمالیاتی حس کا ویسا ہی مظہر ہے جیسا اور کوئی فن لطیف، فن خطاطی اور اس کی فنکارانہ تزئین وتہذیب نے نئے نئے اسلوب پیدا کیے ہیں۔ جن پر قرار واقعی بحث کے لئے بڑی فنی بصیرت درکار ہے، قرآن مجید کے نسخے خطاطی اور نقاشی کی تاریخ کے لئے اہم ماخذ ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن مجید کے اہم نسخوں کی مکمل فہرست تیار کی جائے، پھر کوئی ادارہ ان اہم نسخوں سے ضروری عکسی اقتباسات حاصل کرے، اور متخصصین کے تعاون سے قرآن کے خط کی ایک تاریخ موجودہ مواد کے پیش نظر تیار کی جائے مخطوطے جس تیزی کے ساتھ تلف ہو رہے ہیں، خود موجود مخطوطے اس پر اپنی زبان بے زبانی سے گواہی دے رہے ہیں، امید کرتا ہوں کہ وقت کے اس شدید تقاضے کا احساس ہوگا اور جلد از جلد مؤثر عملی قدم اٹھایا جائیگا۔

ارض القرآن

(حصہ اوّل ودوم)

پہلے حصہ میں عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار کی تحقیقات سے تصدیق و تائید ہوتی ہے، دوسرے حصہ میں قرآن کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے ان میں سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان، اور مذہب پر تفصیلی مباحث ہیں (مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی ؒ)

قیمت حصہ اوّل ۱۳ روپے قیمت حصہ دوم ۱۰ روپیے

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

از

ڈاکٹر محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی، امر سنگھ کالج (کشمیر)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف جون سنہ ۶ء)

سید جمال الدین محدث | سید موصوف بلند پایہ عالم دین بالخصوص علم حدیث کے مستند عالم تھے، سلطان قطب الدین کی درخواست پر میر سید علی ہمدانی نے انھیں کشمیر بھیجا، انھوں نے یہاں اصلاح و تبلیغ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا، یہاں کے اکابر علماء ان سے مستفید ہوئے تھے، بادشاہ بھی ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اور ان کو عمدۃ المحققین کا لقب دیا تھا، بعد میں ان کا محلہ بھی جو خانقاہ (سرینگر) میں جہلم کے کنارے پر واقع ہے، اسی نام سے مشہور ہوا، اور بالآخر یہ نام بگڑ کر آرودھ جن گیا، وہ یہیں آسودہ بھی ہیں، ان کے مقبرے میں کئی اور بزرگ دفن ہیں[1]۔ رشتہ کے لحاظ سے آپ میر سید علی ہمدانی کے خال تھے[2]۔

سید کبیر بیہقی | شیخ ہمدانی کے رفقاء اور مریدوں میں سے تھے، رات دن ان ہی کی خدمت میں

---

[1] تاریخ سید علی (قلمی) [2] نفحات کبرویہ (قلمی) نسخہ جات ریسرچ لائبریری سرینگر۔

رہتے تھے، بعد میں شیخ ہمدانی ہی کے حکم سے محلہ علاؤ الدین پورہ (سرینگر) میں اقامت اختیار کی اس سے متصل راجہ پرورسین کے عہد کا بنایا ہوا ایک بڑا بت خانہ تھا، خود سلطان قطب الدین شیخ ہمدانی کی صحبت سے مستفید ہونے سے قبل اس بت خانہ میں آیا کرتا تھا، یہاں ایک راہب بھی رہتا تھا جس کا نام شاپور تھا، وہ شیخ ہمدانی کی کوششوں سے مسلمان ہوا، اور انھوں نے اس کا نام محمد رکھا، اس نو مسلم راہب کی تربیت اور سرپرستی بعد میں ایک دوسرے بزرگ حاجی محمد بلخی کے سپرد کی، غرض شیخ ہمدانی نے اس بت خانہ کی اہمیت ختم کرانے کے لیے اس کے آس پاس متعدد بزرگوں کو متعین کیا، جن میں ولی کامل سید کبیر بیہقی بھی ایک تھے[1]۔

مولانا پیر محمد بلخی بلند پایہ عالم، کلام اللہ کے حافظ، ہفت قرأت کے ماہر اور باطنی اسرار و معارف کے شناسائے کامل تھے، قرآن حکیم سے گہری محبت رکھنے کی بنا پر قاری کے لقب سے مشہور تھے، حضرت شیخ ہمدانی نے انھیں سلطان قطب الدین کی اصلاح کے لیے مقرر کیا، سلطان نے ان کے مطبخ اور لنگر وغیرہ کے اخراجات کے لیے دو پرگنوں کی آمدنی وقف کر رکھی تھی، مولانا موصوف یہاں کے ان ائمہ مساجد اور موذنین کی نگرانی بھی کرتے تھے، جنھیں حکومت کی طرف سے وظائف مقرر تھے، شیخ ہمدانی کی مراجعت کے بعد کافی وقت تک زندہ رہے، اور تبلیغی و اصلاحی خدمات انجام دیتے، ۱۰، رجب ۸۱۲ھ کو انتقال کیا، انتقال کے وقت یہ دو اشعار زبان پر تھے،

زیں جہاں رفتیم و دل بر داشتیم — باجہان بانان جہاں بگذاشتیم
ایمن جستیم از دست اجل، — داد رینا ما غلط پندا شتیم

انتقال کے دوسرے دن سلطان قطب الدین بہت سے لوگوں کے ساتھ آیا، خانقاہ معلیٰ (سرینگر) میں شیخ ہمدانی کے صفہ کے قریب نماز جنازہ ادا کی گئی، اور محلہ لنگرٹہ میں دفن

[1] تاریخ اعظمی: ص ۳۹۔

کیے گئے، ان کے مقبرے میں اور بھی سادات اور اولیاء سپرد خاک کیے گئے، سلطان قطب الدین نے جب ۷۹۶ھ میں انتقال کیا تو اسے بھی یہاں دفنایا گیا، اب یہ مقبرہ سلطان قطب الدین ہی کے نام سے موسوم ہے[1]۔

سید محمد کاظم موصوف حضرت شیخ ہمدانی کے ذاتی کتب خانہ کے لائبریرین تھے، علم و فضل کے ساتھ ولایت و روحانیت میں بھی بلند مقام کے حامل تھے،

پان پور سے متصل للہ پورہ میں ایک بڑا بت خانہ تھا، وہ ویران تھا، شیخ ہمدانی نے سید محمد کاظم کو اسی جگہ قیام کرنے کا حکم دیا، انھوں نے یہاں آخری دم تک دین حق کا پرچار کیا، اور چھوٹے بڑے کی اصلاح کی، عوام میں سید قاضی کے نام سے مشہور تھے،

ان بزرگوں کے علاوہ شیخ ہمدانی کے رفقاء میں جن مبلغین نے کشمیر میں ناموری حاصل کی، ان میں سید محمد باقر، سید محمد بزرگ، سید رکن الدین، سید فخر الدین، سید محمد قریشی، سید محمد عبد اللہ، میر سید کمال، میر سید جلال عطائی، میر سید فیروز، میر سید حیدر، سید عزیز اللہ، سید محمد مراد، شیخ سلیمان، سید محمد بیہقی، سید محمد عین پوش، سید نعمت اللہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[2]۔

تیسری سیاحت شیخ ہمدانی کی تیسری سیاحت کشمیر سے متعلق معلومات تاریخوں میں نہیں ہیں، اسی وجہ سے بعض معاصر اہل علم ان کی صرف دو سیاحتوں کے قائل ہیں، مورخ غلام حسن نے ملا احمد علامہ[3] کی تاریخ سے نقل کیا ہے کہ شیخ ہمدانی نے دوسری سیاحت کشمیر کے بعد

[1] فتحات کبرویہ (قلمی)، از شیخ عبد الوہاب نوری، ص ۴۱۰ [2] ان کے حالات کے لیے، دیکھئے فتوحات کبرویہ، تاریخ سید علی اور تاریخ حسن ج ۳، یہ تینوں کتابیں ابھی غیر مطبوع ہیں، [3] یہ سلطان زین العابدین کا درباری عالم، اس کی تاریخ کا نام واقعات کشمیر ہے، جو اصل میں ایک

بعض ممالک کی جانب سفر کا ارادہ کیا، بالخصوص اصحاب کہف کے غار کی زیارت کی، جو شہر افسوس (افیس: [illegible] مراد ہے،) میں واقع ہے، واپسی پر کشمیر ایک اور مرتبہ تشریف لائے یہ ان کی تیسری اور آخری سیاحت تھی، یہاں مختصر مدت تک قیام کیا، جو لگ بھگ چھ ماہ پر مشتمل ہے، اس کے بعد پھر فارس کا ارادہ کیا مگر ابھی کنیر سوادی پہونچ پائے تھے کہ انتقال فرمایا،

تبلیغی کارنامے | کشمیر میں جو روحانی، فکری اور ثقافتی انقلاب آیا، وہ سراسر میر سید علی ہمدانی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے، شیخ ہمدانی نے ایک محتاط اور خیر خواہ مبلغ کی طرح یہاں نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا کام شروع کیا، اور اسی احتیاط مگر انہماک کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا، انھوں نے سب سے پہلے کشمیر کے تعلقات ان ممالک سے یک قلم منقطع کیے، جو بدھ مت اور ہندو مذہب کے علمبردار بلکہ اس کے مرکز و محور تھے، اس کے برعکس انھوں نے کشمیر کا رابطہ ان ممالک سے جوڑا جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی فکر اور اسلامی فن و ادب کا سرچشمہ تھے، انھوں نے بے شمار کتابیں لکھیں، ان کے رفقاء وسط ایشیا سے بے شمار کتابیں ساتھ لائے، حکمرانِ کشمیر ان کے قدموں پر گرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا تھا، مگر وہ بدستور ہاتھ سے ٹوپیاں بنا کر کسبِ حلال سے اپنی زندگی گزارتے تھے، یہی درس انھوں نے اپنے رفقاء و متعلقین کو بھی دیا تھا، وہ خود مسلکاً شافعی تھے، وہ اگر چاہتے تو یہاں بھی بغیر کسی ادنیٰ مشکل کے اسی مسلک کو پھیلاتے، مگر چونکہ ان کے پیش رو مبلغ سید شرف الدین عبد الرحمٰن نے حنفی ہونے کی وجہ سے یہاں اسی مسلک کے مطابق تبلیغ کی تھی، اس لیے شیخ ہمدانی نے اسی مسلک کو برقرار رکھا، اور اسی کے مطابق لوگوں کو عبادات و عقائد کی تعلیم دی، اس حکمتِ عملی سے انھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹ سنسکرت تاریخ "راج ترنگنی" کا فارسی ترجمہ ہے، کتاب نایاب ہے، مورخ حسن کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا،

دین کی بڑی خدمت انجام دی، طبقۂ امراء و سلاطین کی اصلاح اور راہنمائی کے لیے ایک خاص کتاب لکھی جو ذخیرۃ الملوک[1] کے نام سے مشہور ہے، اس میں سلاطینِ اسلام کو عموماً اور سلاطینِ کشمیر کو خصوصاً اپنی عظیم ذمہ داریوں اور منصبی فرائض کا عجیب و غریب انداز و اسلوب سے احساس دلایا، اس کتاب میں ان کی ایک خاص اصطلاح "سلطنتِ معنوی" ہے، یہ اصطلاح کتاب کے تمام مباحث کا محور و مرکز ہے، اس کی رو سے دنیاوی بادشاہی مکمل طور پر "حقیقی بادشاہی" کے مطیع و منقاد ہونی چاہیئے، علامہ ابن خلدون کا مقدمہ اگرچہ اس موضوع پر ہر لحاظ سے محیط اور سائنٹفک ہے، مگر اس کے باوجود مقدمہ ابن خلدون اس اہم نکتے پر خاص روشنی نہیں ڈالتا ہے، میر سید علی ہمدانی نے ذخیرۃ الملوک میں اس کمی کو پورا کیا، شیخ ہمدانی اور علامہ ابن خلدون دونوں ہم عصر تھے، کیا شیخ ہمدانی کی نظروں سے مقدمہ ابن خلدون گزرا تو نہ تھا؟

سلاطین کی اصلاح و تربیت کے لیے شیخ ہمدانی نے مکتوبات بھی لکھے، سلاطینِ کشمیر کے نام مکتوبات کا ایک مختصر مجموعہ بھی ان سے منسوب ہے، جو شائع بھی ہوا ہے، یہ خطوط شیخ ہمدانی کی ندرتِ فکر و بصر کا عمدہ نمونہ اور جذبۂ اعلاء کلمۂ حق کا واضح ثبوت ہے، ہم ایک مکتوب کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، یہ مکتوب انھوں نے کشمیر کے ایک بادشاہ کو لکھا ہے، مکتوب رسمی آداب و القاب سے پاک و صاف ہے، درج ذیل آیتِ شریفہ سے شروع ہوتا ہے،

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور،

---

[1] ذخیرۃ الملوک کا تعارف اور اس کی اہمیت کے لیے ملاحظہ کیجیے، راقم کا مضمون "علم حدیث کی اشاعت میں علمائے کشمیر کا حصہ" قسطِ اول ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند اگست ۱۹۷۶ء۔

اہلِ علم حضرات اور حاملینِ نفوسِ قدسیہ پر یہ مخفی نہیں ہے کہ انسانی طبائع اپنی خصوصیات کے لحاظ سے جدا جدا ہیں، اس تباین سے امم عالم کے اقوال و افعال میں بھی اختلافات ظاہر ہوئے، چونکہ برے اخلاق اور گندے اوصاف (از قبیلِ ظلم و جبر، فتق و فساد) انسان کی فطرت میں داخل ہیں، اس لئے مخلوقات کے اغراض اور مقاصد بھی مختلف واقع ہوئے، پس اللہ کی حکمتِ بالغہ کا یہ تقاضا ہوا کہ حاکم بلند اوصاف سے متصف ہو جو اولادِ آدم کے حرکات و سکنات کو راہِ صواب اور منزلِ رشد و ہدایت پر ڈالدے نیز وہ شریعت کے نفاذ میں حتی الوسع کوشش کرے۔ مظلوموں اور ضعیفوں کو پنجۂ استبداد سے نجات دلائے، ظالموں کو اپنی گرفت میں لائے، تاکہ عالمِ صوری کا نظام برقرار رہے، اور عوام و خواص کے مابین وحشیانہ حرکات صادر نہ ہونے پائیں، انبیاءؑ کی بعثت اور علماء کی معرفت کا مقصد بھی یہی ہے کہ حق باطل سے اور اصلاح فساد سے بالکل جدا اور ممیز رہے، اگر حاکم اس عمل پر گامزن رہے، تو محشر کے دن حاکم و محکوم دونوں جبارِ حقیقی کی سطوت و صولت سے محفوظ اور مصئون رہیں گے، اگر ایسا نہ کیا تو اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ کے تحت ان سے باز پرس ہوگی، اس لئے بادشاہ اور حاکم کو چاہیئے کہ وہ اپنا منصب پہچانے بندگانِ خدا کے معاملات کی دیکھ بھال کرے، سلاطینِ اسلام اور خلفائے راشدین کی سیرتوں پر غور کرے، اپنے آپ کو شاہی آداب سے عاری نہ سمجھے، دنیا کی نعمتوں کو اپنی بگ ردی سے آخرت کی حسرت و ناامیدی کا بیج نہ بنائے، فانی دنیا پر اعتماد نہ کرے، قیامت کی ذلت و گرفتاری سے غافل نہ رہے، اور فرصت کے دنوں

کو غنیمت سمجھے، وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی [۱]

کشمیر میں میر سید علی ہمدانی کے زمانے میں لوگ توہمات و طلسمات کے اسیر ہوگئے تھے ان کے نزدیک بھی قدیم عرب جہلاء کی طرح انسان اور انسانیت کی فضیلت کا معیار کرتب بازی اور شعبدہ بازی بن گیا تھا، اس میں شک نہیں ہے کہ اس ذہن کو پیدا کرنے کے ذمہ دار کافی حد تک اُس وقت کے ہندو مذہبی رہنما تھے، للہ عارفہ اس جماعت سے سخت نالاں تھی اور ان پر کھل کر اظہارِ افسوس کرتی تھی، یہ کرتب ساز ابتداء میں شیخ ہمدانی کی راہ میں بھی حائل ہوئے، مگر جلد ہی ناکام بھی ہوئے، کالی شوری مندر کے شعبدہ باز مجاور نے شیخ ہمدانی کو چیلنج بھی کیا، لیکن جب اس کرتب کا بھی وہی حال ہوا جو کسی زمانے میں عصائے موسیٰ کے سامنے ساحرینِ مصر کی بازیگری کا ہوا تھا تو یہ مجاور فوراً مسلمان ہوا، اور اس اثر سے دوسرے ہزاروں کشمیری باشندے بھی مسلمان ہوئے، تذکروں میں اس طرح کے کئی اور واقعات منقول ہیں،

میر سید محمد ہمدانی ۔ شیخ ہمدانی نے چالیس سال کی عمر میں نکاح کیا تھا، اس طرح ان کی تاریخِ ولادت مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نکاح کم و بیش ۷۵۲ھ میں ہوا تھا، بہت دنوں کے بعد ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا جو تاریخ میں میر سید محمد ہمدانی بن میر سید علی ہمدانی کے نام سے مشہور ہیں، میر محمد ہمدانی کی تاریخِ ولادت کسی تذکرہ میں مذکور نہیں ہے، البتہ کئی تذکرہ نگاروں کے مطابق شیخ ہمدانی کے انتقال کے وقت میر محمد ہمدانی کی عمر بارہ سال کی تھی، اس طرح، شیخ ہمدانی کی تاریخِ وفات ملحوظ رکھ کر میر سید محمد ہمدانی کی تاریخِ ولادت

---

[۱] مکتوبات میر سید علی ہمدانی (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر بحوالہ اصول التصوف: دکتر احسان اللہ ص ۲۹۰، مطبوعہ طہران ۔

تا ۷۷۶ھ متعین ہوئی ہے، میر ہمدانی اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے دس سال بعد ۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں کشمیر تشریف لائے، جبکہ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی، کشمیر تشریف لانے کی وجہ والد بزرگوار کی وصیت تھی، جو انھوں نے اپنے رفقاء بالخصوص شیخ نورالدین جعفر بدخشی کے ذریعہ پہونچائی تھی، جب میر سید محمدؐ ہمدانی کشمیر تشریف لائے تو یہاں سیکڑوں صلحاء اور غیر ملکی سادات موجود تھے، اس وقت وسط ایشیاء کے مزید تین سو اکابر آپ کے ساتھ تھے، یہ زمانہ سلطان قطب الدین کے بیٹے سلطان سکندر (۱۳۸۹ء تا ۱۴۱۳ء) کا تھا، سلطان سکندر بھی اپنے باپ کی طرح سخت مذہبی اور نو وارد مبلّغین کا غالی معتقد تھا، اس نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی شریعت کے نفاذ میں غیر معمولی دلچسپی لی، بلکہ اس مذہبی حمیت میں اس نے تشدد بھی اختیار کی، جس کی بنا پر وہ آج بھی ہندو مذہب کے پیروؤں میں معتوب و مغضوب ہے[1]، مگر حق بات یہ ہے کہ اس کی مذہبی پالیسی کو بیان کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے مؤرخوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی مبالغہ آمیزی کی ہے، اور اس کی شدت کا ذمہ دار اس کے مربّی اور مرشد میر محمد ہمدانی کو ٹھہرایا، جو ایک بے دلیل دعویٰ ہے، میر سید محمدؐ جب کشمیر تشریف لائے، تو سلطان سکندر نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، اگرچہ میر سید محمدؐ ہمدانی کی عمر اس وقت صرف ۲۲ سال کی تھی، مگر کچھ اپنے نمایاں علم و فضل اور کچھ اپنے نامور والد بزرگوار کی شہرت و عقیدت سے انھیں عزت و احترام سے دیکھا گیا، معاصر مؤرخ جون راج تک معترف ہے کہ "محمد اپنے ساتھیوں میں ایسے ہیں جیسے تاروں میں چاند"[2] میر محمد ہمدانی تنہا تشریف نہیں لائے تھے، بلکہ شیوخ و اکابر کا

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "کشمیر میں اسلامی عروج و زوال" برہان، دہلی نومبر ۱۹۶۹ء

[2] Tonarajas Rajtarangani: P 94

ایک بڑا کارواں بھی ان کے ساتھ تھا، انھوں نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر ان بزرگوں کو کشمیر کے مختلف اطراف و اکناف میں پھیلایا، وہاں کے لوگوں کی اصلاح و تربیت اور اسلام کی ترویج و اشاعت پر مامور کیا،

سلطان سکندر کو حضرت میر محمدؐ کے ساتھ گہری عقیدت تھی، وہ ان کے علم اور روحانی کمالات سے استفادہ کرتا تھا، میر محمدؐ کو بھی سلطان کے اخلاص اور مذہبی حمیت کا احساس تھا، انھوں نے سلطان کے لیے تصوف میں ایک رسالہ لکھا، جسے بعد میں سلطان ہی کے نام پر الرسالۃ الاسکندریۃ سے موصوف کیا، اسی طرح اس زمانے میں سلطان سکندر کے وزیرِ اعظم سہہ بٹ کی وزارت عروج پر تھی، وہ مذہب ہندو کو چھوڑ کر سچے دل سے مسلمان ہوا تھا، حضرت میر محمدؐ نے اس کا نام ملک سیف الدّین رکھا، نئے مذہب نے اس کے اندر سخت جوش اور ولولہ پیدا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسلام کا پرجوش داعی بنا، بلکہ وہ اس جذبۂ اشاعتِ اسلام سے اس قدر مغلوب ہوا کہ وہ ایک عادل وزیر اعظم کے بجائے میدانِ جنگ کا باجبروت مجاہد نظر آیا، میر سید محمدؐ کے عقد میں کشمیر کی دو نیک سیرت عورتیں تھیں، جب وہ کشمیر تشریف لائے تو ابھی تک ان کا نکاح نہیں ہوا تھا، چنانچہ ان کا پہلا نکاح حضرت سید حسن بہادر کی صاحبزادی تاج خاتون سے ہوا، مگر وہ شادی کے پانچ سال بعد انتقال کر گئیں، اس کے بعد نو مسلم وزیرِ اعظم ملک سیف الدّین نے اپنی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کیا، مگر یہ رفیقۂ زندگی بھی بہت جلد داغِ مفارقت دے گئیں، دونوں بیویاں کشمیر ہی میں سپردِ خاک ہیں[1]،

میر سید محمدؐ نے کشمیر میں بارہ سال تک قیام کیا، یہ ان کی اٹھتی ہوئی جوانی کا عالم

---

[1] تاریخ اعظمی، ص ۲۳ -

تھا۔ انھوں نے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ کشمیر میں اسلام پھیلایا، کشمیری الاصل بزرگوں کے ساتھ بھی ان کے گہرے تعلقات تھے، ان میں حضرت شیخ نور الدین ریشی کشمیری کا نام قابل ذکر ہے، حضرت شیخ ریشی ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہو کر علمی راہنمائی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے تھے، حضرت شیخ اپنی زندگی کی ابتدا میں خلوت گزیں اور گوشہ گیر تھے مگر پھر ان پر اصلاح، تجدید اور تبلیغ کا رنگ غالب آیا، یہ بے شک حضرت میر محمد ہمدانی کی صحبت کا نتیجہ تھا۔[1]

---

[1] کہتے ہیں کہ میر سید محمد ہمدانی نے شیخ نور الدین کو خطِ ارشاد کے نام سے ایک اجازت نامہ دیا تھا، اس کی اصل بھی (بقول بعض لوگوں کے) موجود ہے، اس کی نقل صاحب فتوحات کبرویہ نے اوّل سے آخر تک اپنی کتاب میں درج کی ہے، جس کی زبان عربی ہے، مگر تاریخی اعتبار سے یہ اجازت نامہ اس وقت بے اعتبار بن جاتا ہے، جب ہم اس کی تاریخ تحریر یوں پڑھتے ہیں:-

قد حررت هذه الی لیکته	یعنی میں نے یہ اجازت نامہ ۲۵
الجمعة خامس من عشرین من	ماہ رجب ۸۱۴ھ بوقت شب
شهر رجب المرجب سنة	جمعہ کشمیر میں لکھا،
اربعة وعشر ثما نماية فی	
بلد الکشمیر	

مختلف تاریخوں کو تطبیق دے کر ہم نے اوپر ثابت کیا کہ میر سید محمد ہمدانی ۸۰۸ھ میں کشمیر سے تشریف لے گئے تھے، مزید براں اس اجازت نامے کے بعض الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اسکو حضرت میر محمد ہمدانی کی طرف منسوب کرنا ظلم ہے، اس میں جہاں اور اد و اذکار پر مداومت کرنے، بہ ہمدانی کی اصلاح: تربیت اور دونوں کو مکانا و مفاسد سے دور رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

میر سید محمد اپنے نامور والد کی طرح صاحبِ تصنیف بھی تھے، علم منطق میں ان کا رسالہ "شرح شمسیہ" مشہور ہے[1]، تصوف میں ان کے دو رسالے کتاب الاخلاق اور الرسالۃ الاسکندریہ آج بھی موجود ہیں[2]، ان کا ایک اور رسالہ مولانا عبد الحئی حسنی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۲۳ء) کو دستیاب ہوا تھا[3]، یہ رسالہ شاید آج بھی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے، مولانا کے لکھنے کے مطابق اس کا نام جامع الفنون ہے، اور اس کا تعلق منطق اور حکمت کے ساتھ ہے، شیخ عبد الوہاب نوری لکھتے ہیں کہ میر سید محمد نے مکتوبات کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا ہے، بلکہ بقول ان کے تصوف میں حضرت میر نے چھوٹے بڑے پینتالیس رسالے لکھے ہیں[4]،

کشمیر میں بارہ سال قیام کرنے کے بعد میر سید محمد نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، مگر بعض مورخین کے نزدیک کشمیر چھوڑنے کی اصل وجہ ایک دوسرے ہم نام بزرگ حضرت سید محمد حصاری کے ساتھ ٹکراؤ تھا[5]، ممکن ہے یہ صحیح ہو، معاصرانہ چشمک بزرگوں میں بھی ہوا کرتی ہے، کشمیر چھوڑنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) وہاں "نذر و نیاز" قبول کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی صاحبِ علم گمر پیشہ درجاور کا وضع کیا ہوا ہے، پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شیخ عبد الوہاب نوری کی قابلِ قدر کتاب فتوحاتِ کبرویہ نہایت احتیاط سے پڑھنے کی مستحق ہے، اس کی تاریخیں اکثر غلط یا محلِ تحقیق ہیں، مورخ سید علی اور صاحب اسرار الابرار نے بھی حضرت شیخ نور الدین ریشی اور حضرت میر سید محمد ہمدانی کی صحبتوں اور محفلوں کا ذکر کیا ہے، مگر کسی خطِ ارشاد کا نام تک نہیں لیا ہے، شیخ داؤد مشکواتی لکھتے ہیں:-

بسیار مشائخ را دیدہ بود و با شیخ نور الدین قدس سرہٗ بسیار سوال و جواب زدہ رفتہ

(اسرار الابرار، قلمی)

[1] The coutribution of gndia to Arabic Literature

کے بعد حضرت میر محمد ہمدانی پھر کبھی کشمیر تشریف نہ لائے، وہ یہاں سے [illegible] یا [illegible] میں کشمیر سے تشریف لے گئے، اور اس کے بعد چھیالیس[۴۶] سال تک بقید حیات رہے، [illegible] میں انتقال کیا، اور اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں بمقام ختلان دفن ہوئے، ان کی حیات کے آخری ۴۵ سال کے کارنامے اور دینی خدمات مکمل طور پر پردۂ خفا میں ہیں۔[۱]

میر محمد ہمدانیؒ کے رفقاء جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، حضرت میر کے ساتھ سیکڑوں بزرگ کشمیر تشریف لائے تھے، جن کے مشاغلِ علمی سے کشمیر سلطان سکندر کے زمانے میں خراسان اور عراق کا حریف بن گیا تھا، سلطان نے دل کھول کر ان بزرگوں کی پذیرائی کی، اور انھیں مختلف علمی اور تبلیغی مراتب و مناصب عطا کیے، سید محمد حسین سامانی نے علم فرائض و میراث کے مشہور رسالہ "سراجی" کی شرح لکھی، جس کا نام تنویر السراج رکھا، سید محمد خاوری حدیث و قرآن کے بلند پایہ عالم تھے، انھیں قضا کا منصب عطا ہوا، خود سلطان سکندر، سید حسین خوارزمی سے مستفیض ہوتے اور فیوض حاصل کرتا تھا، اور اپنے دو بیٹوں علی شاہ اور زین العابدین کو ان ہی کے دامن ارادت سے وابستہ کیا، مولانا قاضی حسین شیرازی دینی علوم میں ماہر تھے، اور انھیں بھی محکمۂ قضا میں رکھا گیا، مولانا شیرازی قاضی ولی کے نام سے مشہور تھے، غرض یہ سب بزرگ اس زمانے میں کشمیر کی زینت بنے، جب کشمیر کے حالات مکمل طور پر ان کے موافق تھے، انھیں دینی خدمات انجام دینے میں کسی بھی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا، سید علی، مولوی غلام حسین، محمد اعظم اور شیخ

۱؎ B.Y. Dr. Zubaid Ahmad. P. 345

۲؎ دونوں رسالے مخطوطہ کی صورت میں ریاستی ریسرچ لائبریری سرینگر میں موجود ہیں،

۳؎ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ج ۳ ص ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴ فتوحات کبرویہ (قلمی)،

شیخ عبد الوہاب نوری کی اسرار الابرار (قلمی)، شیخ بابا داؤد مشکواتی،

عبد الوہاب نے اپنی تاریخوں میں ان میں سے مشہور بزرگوں کے حالات بیان کیے ہیں۔

میر سید علی ہمدانی اور کشمیر کشمیر کے عام باشندوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً میر سید علی ہمدانی کے جو احسانات اور برکات ہیں، اس کا اعتراف یہاں کے لوگوں نے ہر وقت کیا ہے، یہاں کے صلحا، اور اکابر علماء نے نظم و نثر میں انھیں خراج عقیدت ادا کیا ہے، یہاں کے لوگ آج بھی اوراد و اذکار اور وظائف میں شیخ ہمدانی کی منقبتیں پڑھ کر سرور حاصل کرتے ہیں، وہ شیخ ہمدانی کو کشمیر میں اسلام کا بانی، امیر کبیر، علی ثانی، شاہ ہمدانی جامع الکمالات وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں، اور کشمیر کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی بنا پر "ہمدانی کشمیری" سے یاد کرتے ہیں، شیخ ہمدانی نے کشمیر میں جس جس مقام پر قیام کیا، نماز پڑھی ہے، یا اذکار و وظائف پڑھے ہیں، کشمیر کے مسلمان اسے مقدس اور مطہر سمجھتے ہیں، بالخصوص سرینگر کی خانقاہِ معلیٰ کشمیر کا متبرک ترین مقام سمجھا جاتا ہے، ایک شاعر اس خانقاہ کی تعریف میں کہتا ہے،

خانقہ عرش نشاں است ایں   مسجد شاہ ہمدان است ایں

سید السادات عدیم العدیل   خاک درش سجدہ گہ جبریل

مردمک دیدۂ پیغمبر است   زہرۂ زہرا جگر حیدر است

ایک دوسرا شاعر اس طرح رطب اللسان ہے:-

خانقاہ است ایں مگر یا مسجد اقصیٰ است ایں   مسکن امن و اماں یا جنت الماویٰ ست ایں

سقف مرفوع است ایں یا قبۂ چرخ بریں   یا مگر از رحمتِ حق خیمہ برپا است ایں

حجرۂ خاص است ایں یا مشرقِ نور جلال   یا محلِ فیض حق یا وسعت دلہا ست ایں

درمیان قندیل یا شمع ہدایت روشن است   یا مگر نورِ تجلی یا ید بیضا است ایں،

ایں ستوں یا نخلِ ایمن یا کہ طوبیٰ بہشت — یا بزمِ اہلِ عرفاں شاہدِ رعناست ایں

پیر ما سید علی یا جامعِ فضل و کرم — یا علیؑ ثانی دریا و دل یکتاست ایں

وردِ اوراد او یا پی شنبۂ اسمِ اعظم — یا ز تسبیحِ ملائک بر زمیں غوغاست ایں

حلقۂ اوراد یا سر رشتۂ جمعیت است — یا صفِ از قدسیانِ عالمِ بالاست ایں

علمائے کشمیر نے حضرت شیخ ہمدانیؒ کی کتابوں کو محفوظ رکھا، ان کی نقلیں پھیلائیں، بعض رسالوں کی شرحیں لکھیں، صاحبِ ذوق بزرگوں نے ان کی شان میں عمدہ سے عمدہ قصیدے لکھے ہم یہاں کشمیر کے تین بزرگوں کے منتخب اشعار درج کرتے ہیں، یہ اشعار انھوں نے شیخ ہمدانی کی مدح و توصیف میں کہے ہیں، یہ تینوں بزرگ کشمیر کے صفِ اوّل کے علماء و مشائخ میں گنے جاتے ہیں، میری مراد شیخ یعقوب صرفی، شیخ مرزا اکمل الدین بدخشی اور شیخ حبیب اللہ نوشہری رحمہم اللہ سے ہے۔

شیخ یعقوب صرفی شیخ صرفی کے کمالات سے ہمارے قومی تذکرے بھرے ہیں، ملا عبدالقادر بدایونی شیخ صرفی کے معاصر تھے، انھوں نے بڑی عزت اور فخر کے ساتھ منتخب التواریخ میں ان کے فضل و کمالات کا اعتراف کیا ہے، فیضی جیسے عالم نے اپنی تفسیر سواطع الالہام پر ان سے تقریظ لکھوائی، ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے حالات اور علمی کمالات بیان کئے ہیں، حضرت صرفی کو شیخ ہمدانی کے ساتھ گہری عقیدت تھی، انھوں نے ان کی شان میں دل آویز منقبتیں کہی ہیں اور اپنے آپ کو "گوشۂ امیری" سمجھنے پر فخر کیا ہے، انھوں نے ختلان جاکر حضرت امیرؒ کی آخری خوابگاہ کی زیارت بھی کی ہے، بلکہ وہاں چلہ بھی کیا ہے، فخر کے ساتھ کہتے ہیں:۔

"مشرف شدہ ایں فقیر حقیر بطوافِ مزارِ امیر کبیر"

وہ انھیں علیؑ ثانی اور سلطانِ اعظم کا نام دیتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے علوم و اسرار کے امین تھے، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ نسب کے لحاظ سے آپ ہی کے فرزند ہیں،

علیؑ ثانی آں سلطانِ اعظم — علی نام ز اولادِ علی ہم

چوں اسرارِ علی از وے عیاں شد — علیؑ ثانی او را نام از آں شد[1]

کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے روحانی مربی اور مرشد آپ ہی ہیں، آپ ہی کے عشق و محبت میں ہماری زندگی ہے، اور اسی میں ہمارا قیام و دوام ہے۔

بحمد اللہ کہ مارا پیشوا اوست — براہِ عشق مارا مقتدا اوست

بحمد اللہ بعشقش زندہ ام من — بعشقش تا ابد پایندہ ام من[2]

فرماتے ہیں کہ حضرت سید علی نہ صرف ہمدانی ہیں، بلکہ ہمہ داں بھی ہیں، ان کے علم و فضل اور روحانی کمالات سے ہمیں پوشیدہ حقائق کی معرفت نصیب ہوئی، اس لحاظ سے وہ عارفوں کے امام برحق ہیں،

ایں ہمدانی ہمہ دانی دہد — معرفتِ سرِ نہانی دہد

ذٰہو امام العرفا بالیقیں — زبدۂ اولادِ شہِ مرسلیں[3]

شیخ صرفی نے اپنی ایک دوسری نظم میں بھی ان ہی جذبات و خیالات کو دہرایا ہے، وہ ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، ان ہی کے مسلک و مشرب کو خدا تک پہونچنے کا سب سے نزدیک راستہ سمجھتے ہیں، انھیں فخر ہے کہ وہ ان کے سلسلہ سے منسلک ہیں اور اتصال کے دوام کے لئے دعاگو ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو دیوانِ صرفی: مرتبہ میر حبیب اللہ کاملی، مطبوعہ سرینگر [2] ایضاً

[3] ایضاً

گرچہ دو صد راہ سوئے مطلب ست
راہِ امام ہمدان اقرب است

وہ چہ نیکو راہی و خوش رہبری
رہبرِ ما در رہِ دین حیدری

ہمچو علی دانشِ ربانیش
زاں لقب آمد علیِ ثانیش

چوں بعلی نسبتش آمد تمام
ہم بہ حسب ہم بہ نسب ہم بنام

از رہِ تعظیم نباشد عجب
گر علیِ ثانیش آمد لقب

ظاہر از و سرِّ علی ولی
بل ہو سرُّ ابیہ العلی

ہست بریں نکتہ دلیلِ قبول
الولد سرٌّ بقولِ رسول

سلسلۂ او کہ در آئینِ عشق
آمدہ زنجیرِ مجانینِ عشق

بستہ ایں سلسلہ اباۓ من
چوں دلِ دیوانہ و شیدائے من

صرفیِ مسکین کہ ہوا خواہِ اوست
از دل و جاں بندۂ درگاہِ اوست

جان و دلش خالی ازیں غم مباد
باد فزوں دمبدم و کم مباد[1]

مرزا اکمل الدین خاں بدخشی مغل دور کے نامور علماء اور مشائخِ کشمیر میں سے تھے، ان کی ضخیم منظوم تصنیف "بحر العرفانؒ" مشہور ہے، یہ کتاب انھوں نے مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی ہے، حضرت فرید الدین عطارؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے ساتھ گہری عقیدت تھی، خود فرماتے ہیں:-

از مریدانِ شیخ عطارم
استعانت از مولوی دارم

حضرت مرزا صاحبؒ اس کتاب میں کئی مقامات پر حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کا ذکرِ خیر کیا ہے، اور ان کے ملفوظات و فرمودات کو بیان کیا ہے، نیز مناسب مواقع پر شیخ ہمدانی

[1] پارسی سرایانِ کشمیر: تالیف دکتر تکو، انتشارات انجمن ایران و ہند، طہران: ص ۹ تا ۱۱

سے صادر ہونے والی کرامتوں کا ذکر کیا ہے، ہم یہاں چند اشعار ذکر کرتے ہیں۔

این علی غوثِ اہلِ دین بودست
ہم بہر غوث جانشین بودست

در جہاں او چو شاہ مردانست
ہر کہ از خویش راست مردانست

علی ثانیش از آں نام است
کہ دلش فارغ از ہمہ کام است

قطب الاقطاب و مرشد و ہادیؒ
دستگیری ہمہ بہر وادیؒ

غوث ہر مستغاث در عالمؒ
روحِ پاکش ہنوز حق محرمؒ

عالمِ ظاہر ست و باطنِ اوؒ
در ہمہ علمہاست فاطنِ اوؒ

ربعِ مسکوں سہ نوبت آں تنہاؒ
دیدہ ہر جا کہ دیر باد یا رہی

یک ہزار و چہار صد عمر شدہؒ
دید ایں ابنِ مصطفیٰ از جد

اہلِ کشمیر را پناہ است اوؒ
رہبرِ خلق تا الٰہ است او

شکر للہ کہ از مریدانم
غیر از و دیگرے نمی دانم

ہر چہ در من ہمہ از ایشان ست
وقفِ عشقش مرا دل و جان ست

اندر آں آستاں غلامِ منیؒ
مدحِ خوانش بہ صبح و شامِ منیؒ

غیر ازیں شاہ کس نمی دانم
ذکرِ یا شاہ ہر زماں خوانم[1]

خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ شیخ نوشہری بھی مغل عہد کے عالم اور صوفی تھے، مشہور کشمیری عالم ملا حسین آفاقی سے دینی علوم کی تکمیل کے بعد شیخ یعقوب صرفی سے معنوی فیوض کی تحصیل کی، شیخ صرفی کے ساتھ جو عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس کا اعتراف ایک جگہ اس طرح کیا ہے،

[1] بحر العرفان (قلمی)

نخلِ جانم ببار از تو رسید　　باغِ من میوہ دار از تو رسید

نامِ من زندہ می کند نامت　　کامِ من کام یابد از جامت[۱]

بلند پایہ صوفی تھے، آخری زندگی میں استغراقی کیفیت غالب رہتی تھی، ایک بار جہانگیر بادشاہ ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر یہاں شیخ کو اسی سرور و مستی میں غرق پایا، انھوں نے منظوم فارسی میں کئی کتابیں لکھی ہیں، عربی میں بھی ایک رسالہ اور متفرق نظمیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی ایک عربی مثنوی مشہور ہے اس میں اگرچہ ادبی لطافت کا فقدان ضرور ہے، مگر چونکہ ہندوستانی عربی شاعری میں یہ مثنوی اپنی قدامت کے لحاظ سے اہم ہے، اس لیے اسے قدر و قیمت حاصل ہے، ہم اسی مثنوی سے چند اشعار نقل کرتے ہیں، اس میں کبروی مسلک بیان کرتے ہوئے کشمیر میں اس کے پہلے مبلغ جناب میر سیّد علی ہمدانی کی عظمت و بزرگی بھی بیان کی ہے، کہتے ہیں:-

کیف لا کیف لا کذا و کذا　　فالامیر الکبیر داخلها[۳]

ذاته کان مثل ذات ابیه　　صفة الابن بالصفات شبیه

ظاهراً کان اعلم العلماء　　باطناً کان اعرف العرفاء

فیضهٔ ظاهرٌ علی العالم　　فضلهٔ شائعٌ بنی آدما

الممات الممات من حبه　　الحیاة الحیاة مشرب به

اشربوا منه ایها الحزناء　　اطربوا منه ایها الفقراء[۲]

---

۱ احوال و مقامات حضرت ایشاں (قلمی)۔

۲ رسالۃ السلوک (قلمی)۔

۳ مراد میر سید علی ہمدانی، اب سے مراد حضرت علی مرتضیٰ اور ابن سے شیخ ہمدانی

حضرت اخی سراج کی آرام گاہ سعد اللہ پور

از

جناب اکمل یزدانی صاحب ایم اے، ڈپ ان ایڈ۔ پورنیہ بہار

سعد اللہ پور، جس سے تقریباً ایک میل پر حضرت سراج الدین اخی عثمانؒ کا مزار شریف[۵] ایک تاریخی مقام ہے، یہ جگہ مالدہ شہر کے انگلش بازار سے چھ میل جنوب مغرب پرانی بھاگیرتی کے کنارے واقع ہے، قدیم دستاویزوں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے،

"پرانی بھاگیرتی کے کنارے، اس متصل (بھولاہاٹ) کے مقابل ایک بازار ہے جسے سعد اللہ پور کہتے ہیں، یہ جگہ اس مقدس ندی کا خاص گھاٹ ہے جس میں ہندو اپنے مردوں کو دور دراز مقامات سے لاکر جلاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ گوڑ کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں بھی جو شاید عدم رواداری کا زمانہ تھا، ہندوؤں کو یہاں مردے جلانے کی اجازت تھی، یہ رسم آج تک (۸۰ء) جاری ہے، اشنان کے لیے بھی بڑی تعداد میں ہندو زائرین یہاں جمع ہوتے ہیں[۵]"

میموائرس آف گوڑ اینڈ پنڈوہ میں عابد علی خاں نے سعد اللہ پور کے اشنان گھاٹ کے متعلق

---

۵ بکانن، پورنیہ رپورٹ مرتبہ جیکسن ص ۱۲، ۱۰۰

لکھا ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کے مردے جلانے کی قدیم جگہ ہے، کہا جاتا ہے کہ گور کے مسلم فرمانرواؤں نے اس جگہ کو ہندوؤں کی رسومات کی ادائیگی کے لیے مخاص کیا تھا، پوس ماہ کی پورنماشی میں یہاں ایک بڑا میلہ لگتا ہے، (میمائرس ص ۱۶۵)

آج کا سعد اللہ پور سعد اللہ پور ان دنوں ایک چھوٹا سا بازار ہے، جو متذکرہ بالا گھاٹ کے مشرقی کنارے پر آباد ہے، یہاں چند دکانیں، کچھ قدیم عمارتیں اور مندروں کے کھنڈرات اب بھی باقی ہیں، اس کا راستہ مالدہ جنکشن سے ہے، سعد اللہ بستی سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر حضرت اخی سراج رح کی ابدی آرام گاہ تک پہونچنے میں ایک تاریخی مسجد بھی نظر آتی ہے، عوام میں یہ مسجد "جھنجھنیاں مسجد" کے نام سے مشہور ہے، لیکن جے ایچ راون شا نے اپنی کتاب "گور، اس کے کھنڈر اور کتبات" شائع شدہ ۱۸۷۸ء میں اس مسجد کو "جن جن میاں کی مسجد" کے نام سے ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نام "جہانیاں جہاں گشت" کی بدلی ہوئی شکل ہے، میموائرس آف گور اینڈ پنڈوہ کے مؤلف کا یہی خیال ہے، یہ مسجد ۵۶ فٹ لمبی اور ۴۲ فٹ چوڑی ہے، تین محرابیں اور چار مینار ہیں، اس مسجد کو ۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء میں بی بی مالتی نام کی ایک معزز خاتون نے تعمیر کرایا تھا، کننگھم کے قول کے مطابق ان خاتون کا تعلق محمود شاہ سوم کے خاندان سے تھا، مسجد کی درمیانی محراب پر یہ عبارت کندہ ہے،

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس
من بنی مسجد للہ بنی اللہ	نے اللہ کے لئے کوئی مسجد بنائی تو اللہ
لہ بیتا مثلہ فی الجنۃ، بنی	تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اسی طرح
ھذا المسجد الجامع فی	کا گھر بنائے گا، یہ جامع مسجد سلطان
عہد السلطان ابن السلطان	غیاث الدین والدنیا ابو المظفر محمود شاہ

غیاث الدنیا والدین ابو المظفر محمود	ابن حسین شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی، اللہ
شاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان	ان کی سلطنت اور ان کے ملک کو
خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ بانیہ بی بی مالتی	ہمیشہ قائم رکھے، یہ مسجد بی بی مالتی نے
دامت سترہا ادام اللہ معالیہا فی سنۃ احدی	۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء میں بنوائی،

خواب گاہ حضرت اخی سراج رح اسی بی بی مالتی کی مسجد سے چند سو گز فاصلہ ہی سے وہ احاطہ شروع ہو جاتا ہے جہاں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے محبوب مرید و مجاز حضرت اخی سراج رح آرام فرما ہیں، حضرت محبوب الٰہی ان کو "آئینۂ ہندوستان" کہا کرتے تھے،

حضرت اخی سراج رح کا مزار ایک بڑے گنبدی قبہ کے اندر ہے، اونچی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ گنبد دور سے ہی نظر آتا ہے، مزار شریف کی شرقی اور غربی سمتوں میں ۱½ فٹ گہرے تالاب ہیں، شمال میں بھی اسی قسم کا ایک تالاب تھا جو اب تقریباً برابر ہو چکا ہے، ان تالابوں کے کنارے کنارے اینٹوں کی مستحکم اور منقش دیواریں تھیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں، ۱۹۲۴ء میں جبکہ عابد علی خاں نے انھیں دیکھا تھا تو صرف شمالی دیوار کم و بیش اصل حالت میں موجود تھی، باقی شرقی اور مغربی دیواریں شکستگی سے ہمکنار تھیں، بکانن نے بھی جب اس مزار کو دیکھا تھا تو گو مزار ایک حد تک مکمل تھا لیکن احاطے شکستہ حال تھے۔

حضرت اخی سراج رح کی قبر خاصی لمبی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو قبریں ایک ہی صف میں ہوں لیکن اس میں حضرت کی درازئ قامت کو دخل نہیں، اصلاً قبر کا شمالی حصہ ان تبرکات، کتب اور پارچہ جات کا مدفن ہے جو حضرت اخی سراج رح کو ان کے پیر طریقت حضرت محبوب الٰہی رح کی جانب

---

[1] سلطان غیاث الدین محمود سوم، سلطان حسین شاہ کا بیٹا تھا، اس کی حکمرانی کا زمانہ ۹۳۹-۹۴۴ھ / ۱۵۳۲-۳۸ء

[2] میموائرس آف گور اینڈ پنڈوہ ص ۹۰ ۔ سالانہ رپورٹ مرتبہ جیکس ص ۱۰۰

سے مرحمت ہوئے تھے، حضرت اخی سراجؒ نے اپنی حیات ہی میں ان کو دفن فرمایا تھا اور وصیت کی تھی کہ جب میرا انتقال ہو تو میرے شیخ کے تبرکات کے پائیں مجھے دفن کیا جائے، اس وصیت کا تذکرہ کتابوں میں موجود ہے، لطائف اشرفی میں ہے،

"چوں وقت سفر آخرت ایشاں پیش آمد، در سواد لکھنوتی قدیم مدفن خود را تعین کردند وانواع لباس مشائخ و اصناف ملابس سلطان المشائخ کہ ہمراہ بودند بہ سر مدفن در مقبرہ منورہ خود ساختند"[1]

اخبار الاخیار میں ہے

"نقست کہ او بعضے جامہا را کہ از خدمت پیر یافتہ بود دفن کرد و بر آں گورے ساخت و در وقت رحلت وصیت کرد کہ مراد ر پایاں گور جامہا دفن کنند بعد از نقل او ہمچنیں کردند"[2]

چنانچہ جب حضرت اخی سراجؒ کا انتقال ہوا تو اُن کی وصیت پر عمل کیا گیا۔

قبر مزار شریف کی تعمیر صاحب ریاض السلاطین کے قول کے مطابق مقبرہ کا بانی نصرت شاہ ہے جس کا عہد ۹۲۵-۳۹ھ کا ہے، اسٹوارٹ نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اس نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، غالباً اس کو نصرت شاہ کے ایک کتبہ سے اشتباہ ہوا جسے نصرت شاہ کے حکم سے حضرت اخی سراجؒ کے روضہ کے دائیں دروازہ پر آویزاں کیا گیا تھا،[3]

اس کتبہ کی عبارت یہ ہے

بنی ھذا الباب للروضة بامر السلطان   روضہ کے اس دروازہ کو سلطان

---

[1] لطائف اشرفی قلمی ۱۲۹۶ پٹنہ یونیورسٹی لطیفہ پانزدہم ص ۱۹-۱۸، ۵ [2] اخبار الاخیار قلمی ص ۳۰ پٹنہ یونیورسٹی، [3] اسٹوارٹ، ہسٹری آف بنگال ص ۱۱۸،

المعظم المکرم السلطان بن السلطان   ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر نصرت شاہ
ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر نصرت شاہ بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ فی سنة احدی ثلثین   ابن حسین شاہ کے حکم سے ۹۳۱ھ (۲۵-۱۵۲۴ء) میں بنایا گیا،

لیکن اس کتبہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ روضہ کا بانی نصرت شاہ ہے درست نہیں، کیونکہ روضہ کے بائیں دروازہ پر ایک کتبہ اور کندہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے حسین شاہ نے ۹۱۶ھ میں تعمیر کرایا تھا، اس کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے،

قد بنی ھذا الباب لروضة المخدوم شیخ اخی   تحقیق کہ مخدوم شیخ اخی سراج الدین کے روضہ
سراج الدین السلطان المعظم المکرم علاء الدنیا   کے اس دروازہ کو سلطان المعظم علاء
والدین المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف   الدنیا والدین ابوالمظفر حسین شاہ سلطان
الحسینی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ سنة ست و عشر و تسعمائة   ابن سید اشرف حسینی نے ۹۱۶ھ میں تعمیر کیا،

اس کے علاوہ ایک اور کتبہ حضرت اخی سراجؒ کے مزار کے قریب ہی ملا تھا، جس پر سنہ تعمیر ۹۱۰ھ (۱۵۰۴-۵ء) درج ہے، اس کتبہ کی عبارت مندرجۂ ذیل ہے،

قال اللہ تعالیٰ من جاء بالحسنة فلہ عشر   اللہ کا ارشاد ہے کہ جس نے کوئی نیکی
امثالہا بنی ھذہ السقایة السلطان المعظم   کی اس کو اس کا دس گنا اجر ملے گا،
المکرم علاء الدنیا والدین ابوالمظفر حسین   یہ سقایہ سلطان معظم و مکرم علاء الدنیا
شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد اللہ   والدین ابوالمظفر حسین شاہ بن سید
ملکہ وسلطانہ فی سنة عشر و تسعمائة،   اشرف حسینی نے ۹۱۰ھ میں بنایا۔

ان کتبات کے سلسلہ میں انڈین میوزیم کلکتہ میں موجود ایک شکستہ کتبہ کی بھی اہمیت ہے، جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہ کتبہ حضرت اخی سراجؒ کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر نصب تھا کیونکہ

اس خالی جگہ کو انہوں نے خود ۱۸۷۹ء میں دیکھا، جنرل کننگھم نے جب اس کتبہ کو پڑھا تو ایک اینٹ پر سبعمایۃ (۷۰۰) دوسری پر غیاث الدین اور شہر محمد آباد لکھا دیکھا، اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ غیاث الدین اعظم شاہ پسر سکندر شاہ (۸۱۳ - ۷۹۲ھ) نے حضرت اخی سراجؒ کے روضہ کی تعمیر کی ہوگی۔ لیکن مسٹر اسٹیپلٹن ایڈیٹر میموائرز آف گور اینڈ پنڈوہ کا قیاس ہے کہ آخری اینٹ پر جو حروف ہیں وہ سبعمایہ کے بجائے تسعمایۃ (۹۰۰) ہیں، لہذا اس روضہ کا معمار غیاث الدین اعظم شاہ کے بجائے غیاث الدین محمود شاہ پسر سلطان حسین شاہ (۹۳۹ - ۹۴۴ھ) ہے، حضرت اخی سراجؒ کا انتقال ۷۴۳ھ یا ۷۵۸ھ میں ہوا، اس صورت میں اگر جنرل کننگھم کی رائے کا اعتبار کیا جائے تو قرین قیاس یہی ہے کہ اولاً روضہ کی تعمیر غیاث الدین اعظم شاہ نے کی، کیونکہ حضرت کے زمانۂ وفات سے قریب تر عہد اسی کا ہے،

عرس | حضرت اخی سراجؒ کا انتقال عید کے دن ہوا تھا، منشی الٰہی بخش مرتب خورشید جہاں نما کے مطابق "زود گو کاں روز عید الفطر بود" سے ۷۴۳ھ تاریخ وفات نکلتی ہے، چنانچہ عید اور بقرعید کے دن ساگر دگھی پر حضرت کا عرس منایا جاتا ہے، پنڈوہ سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا جھنڈا اور حضرت نور قطب عالم کا پنجہ بطور اعزاز یہاں بھیجا جاتا ہے،

ساگر دگھی | سعد اللہ پور کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ساگر دگھی کا ذکر نہ کیا جائے، ساگر دگھی حضرت اخی سراجؒ کے آستانہ سے تقریباً ایک فرلانگ فاصلہ پر ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا تالاب ہے، اس تالاب پر چھ گھاٹ موجود تھے اور ہر ایک کی چوڑائی ۸۰ گز تھی، شرقی غربی کناروں پر آمنے سامنے چار گھاٹ تھے اور شمالی جنوبی کناروں پر دو گھاٹ تھے،

اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گھاٹ پختہ رہے ہونگے، اس تالاب کی موجودگی سے یہ خطہ بہت پُر فضا اور دلکش معلوم ہوتا ہے، بکانن لکھتا ہے کہ ایسا خوبصورت تالاب میں نے کہیں نہیں دیکھا، بکانن اور اسٹیپلٹن کا خیال ہے کہ چونکہ تالاب کی ساخت شمالاً جنوباً ہے اس لئے غالباً یہ کسی ہندو راجہ کا بنایا ہوا ہے، ردون شا کا خیال ہے کہ اس کا عہد تعمیر لکھن سین (بارہویں صدی بعد مسیح) کا زمانہ ہے[1]، لیکن یہ دلیل درست نہیں، کیونکہ چھوٹا ساگر دگھی جسے یقینی طور پر حسین شاہ نے تعمیر کرایا وہ بھی شمال و جنوب کے رخ پر ہی ہے، اسٹیپلٹن کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ تاریخوں میں حسین شاہ کا ۹۱۶ھ کے ایک بڑے تالاب بنوانے کا ذکر ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسی نے یہ تالاب بنوایا ہو یا دوبارہ صاف کرایا ہو، بکانن نے ۱۸۰۸-۱۸۱۰ء میں گور اور اس کے مضافات کا دورہ کیا تھا، ساگر دگھی اسے بہت پسند آیا، اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ تالاب سے ذرا فاصلہ پر شمال مغرب کے رخ پر کھلا بچہ نامی مقام پر ہندوؤں کی ایک اہم عبادت گاہ جسے دوار داسینی کہتے ہیں، جیٹھ کے مہینہ میں اب بھی یہاں ۵۰۰۰ زائرین، اس شہر کی دیوی گوریسوری یا خاتون گور کی پوجا کے لئے ہر سال جمع ہوتے ہیں، اب اسی جگہ مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارتیں ہیں جو شاید مندر کے ہی محل وقوع پر قائم ہیں۔ ان عمارتوں میں سب سے اہم شاہ جلال کا روضہ ہے جو قطب شاہ کے والد علاء الحق کے والد تھے، یہ تمام اشخاص غیر معمولی تقدس کے حامل متصور ہوتے تھے اور بنگال کے مسلم بادشاہوں کے دور حکومت میں بڑے اختیارات رکھتے تھے[2]،

بکانن کی یہ رائے زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، مندر کی جگہ پر مسلمانوں کی

---

[1] ردون شا گور ص ۶
[2] بکانن: پورنیہ رپورٹ ص ۹۹، ۱۰۰

عمارتوں کا قیام اور وہ بھی لفظ شاید سے ثابت کرنا ناانصافی بلکہ تعصب کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ حضرت اخی سراج کے روضہ کو شاہ جلال کا روضہ بتانا تحقیقی مذاق سے عاری ہونے کی دلیل ہے پھر شاہ جلال اور مخدوم علاء الحق میں کوئی نسبی رشتہ نہ تھا، اس لئے بکانن کی شہادت نہ معتبر ہے نہ قابلِ قبول، بہرحال گمان غالب یہی ہے کہ اس ساگر دگھی کو بنوانے والا حسین شاہ ہی تھا۔

ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

مرتبہ :- سید صباح الدین عبد الرحمن ایم۔ اے

ہندوستان میں مسلمان فرماں رواؤں کا عہد تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط تک ختم ہو جاتا ہے، اس ساڑھے چھ سو برس کی مدت میں مختلف مذاق و طبیعت کے تقریباً ۸۴ بادشاہ ہوئے اور انھوں نے یہاں داد حکمرانی دی اور ملک کی تعلیم و ترقی میں حصہ لیا، اور بعض بعض نے تو اپنے حسن طبیعت سے اس کو رشک جنان بنا دیا، اس کتاب میں انہی سلاطین اور انکے عہد کے علماء مشائخ کے باہمی تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس میں ضمناً ہر دور کی مذہبی، دینی و فکری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ضخامت ۲۶۰ صفحے قیمت ۱۰ — ۰۰

کشمیر سلاطین کے عہد میں

مصنفہ ڈاکٹر محب الحسن صاحب کشمیری

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو علمی و تمدنی و سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے اور اس وقت تو ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہیں، اسی لالہ و گل کی سرزمین میں مغل فرماں رواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے۔ ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے،

مترجمہ جناب علی حماد صاحب عباسی پروفیسر شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ قیمت ۱۸ روپے

ایک خط اور اُس کا جواب

مکرمی جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

زیدت حناتکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، مزاج مبارک، میں ایک سفر سے واپس آیا تو آپ کا موقر رسالہ معارف اپریل و مئی کا یکجا ملا، شمارہ ماہ اپریل ۱۹۸۶ء میں مولانا اخلاق حسین صاحب دہلوی کا ایک ایسا مضمون بضمن ملفوظات چھپا ہے جس پر ہم جیسوں کو سخت حیرت ہوئی، سید صاحب الیمنیؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ اگر زندہ ہوتے تو ایسی روایات کبھی چھپنے نہ دیتے، چشتی رسول اللہ کہلانے کی بات درایۃً بھی غلط ہے، کیونکہ خواجہ معین الدین اجمیری کے انتقال کے برسوں بعد چشتیہ سلسلہ قائم کیا گیا تو خود خواجہ معین الدین اجمیری اپنے عہد میں جب کہ چشتی کہنے کہلانے کا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا، کس طرح چشتی رسول اللہ کہلائیں گے، اگر یہ جعلی روایت کرنے والا یوں کہتا کہ خواجہ معین الدین نے کہا کہ کہو معین الدین رسول اللہ تو گویا عقل کی بات ہوتی، بر اصول دروغ گو را حافظہ نباشد اس نے چشتی رسول اللہ کی بات گڑھ لی، ایسی روایات معارف کے علمی و تحقیقی معیار کے ایک دم خلاف ہیں، مزید افسوس اس بات پر ہے کہ دہلوی صاحب نے اس روایت مکذوبہ کی تائید و توثیق میں اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور اس کے انکار کرنے والوں پر اعتراض کیا، بہتر ہوگا کہ اس مضمون کی اشاعت پر آئندہ شمارہ میں آپ کچھ لکھیں، جناب اخلاق حسین صاحب دہلوی سے میری ملاقات ہے، علیک سلیک بھی ہے، رمضان شریف کی شب قدر کے وعظوں میں پھاٹک حبش خاں کی مسجد میں وہ آتے ہیں، دوسری اہل حدیث مسجد میں میں ہوتا ہوں،

ان کی تقریر سننے میں کچھ آجاتی ہے، وہاں اپنے حلقۂ معتقدین میں سب کچھ کہہ سکتے ہیں مگر معارف جیسے پرچے کے لئے بڑی ژرف نگاہی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے زیر سایہ معارف کا مقام اور وقار محفوظ رہے، اس سلسلہ میں مولانا علی میاں مدظلہٗ کو بھی لکھ رہا ہوں، والسلام

ناچیز دعا گو خادم عبدالروف رحمانی، ناظم مدرسہ سراج العلوم، بڑھنی، ضلع بستی ۔ ۳۰ مئی ۱۹۸۰ء

مکتوب نگار نے معلوم نہیں یہ کیسے لکھ دیا کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے انتقال کے برسوں بعد چشتیہ سلسلہ قائم ہوا، یہ ان کی سراسر عدم واقفیت کی دلیل ہے، شجرۂ طریقت کے لحاظ سے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ آٹھویں پشت میں ہیں۔

چشتی رسول اللہ، کا ذکر معارف کے صفحے میں پہلے کئی بار آچکا ہے، راقم نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک سوانح عمری معین الارواح مرتبہ سید خادم حسن زبیری پر ستمبر اور اکتوبر ۱۹۵۰ء کے معارف میں ایک طویل تبصرہ لکھا تھا، تو اس سلسلہ میں حسب ذیل تحریر قلمبند کی تھی،

"معین الارواح کے حصۂ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ ان کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگان دین کے ہرگز نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظات ملاحظہ ہوں جن کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے:

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس

سرہٗ کی خدمت میں حاضر تھا، اہل صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، چونکہ وہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً اس طرح کہا، اور غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا،"

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے، لیکن یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورۂ بالا الفاظ شرعاً قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابل اعتراض نہیں، نیز صاحبانِ حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالمؐ نے بھی طواف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقع پر ارشاد فرمایا "میں نے ان سے سرگوشی نہیں کی بلکہ خدا نے کی" نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا،"

اس تاویل کی حیثیت عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورۂ بالا ملفوظات کو الحاقی کہہ لیں، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے:-

" ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود اودھی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے، آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بالکل غلط ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے حاشا للہ یہ کلام ان کا نہیں ہے، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہیں جو مجاوروں نے بڑھا دیئے ہیں، کسی طرح قطب صاحب قدس سرہ کے حال و اعمال کے موافق نہیں ہیں " (جلد ۲ ص ۱۶۲)

" اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے بعض ملفوظات الحاقی ہیں جو ان کی عملی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہیں "

کچھ دنوں کے بعد راقم نے نومبر ۱۹۶۴ء کے معارف میں یہ لکھا،

فوائد السالکین کی حسب ذیل روایت علمائے ظاہر کی نظر میں کھٹکتی ہے، اس لئے راقم بھی اس کو الحاقی سمجھتا رہا۔

" فرمایا کہ حضرت شیخ معین الدین کی خدمت میں حاضر تھا، دوسرے درویش بھی تھے اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا، اتنے میں ایک شخص باہر سے آیا اور بیعت کے لیے قدمبوسی کی حضرت خواجہ نے فرمایا، بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا، اس نے کہا کہ آپ کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آیا ہوں، انہوں نے فرمایا میں جو کچھ تم سے کہوں، کرو، اور بجا لاؤ، تو پھر مرید کروں گا، اس نے کہا جو حکم ہو فرمایا کہ تم تو کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہو لیکن ایک بار اس طرح پڑھو لا الہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، وہ راسخ العقیدہ تھا اس نے اسی طرح کلمہ پڑھ دیا حضرت خواجہ نے اس کو بیعت کر لیا، خلعت اور بہت کچھ نعمت عطا کی، لیکن اس آدمی سے کہا سنو میں نے تم سے اس طرح کلمہ پڑھایا تاکہ تمہاری عقیدت کا امتحان لوں، ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں

اور کون ہوں، محمد رسول اللہ کا کمترین غلام ہوں اور کلمہ وہی ہے جو تم نے پڑھا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، مرید کو صادق ہونا چاہیئے، ص ۲۳۔۲۴

لیکن اس قسم کی روایت فوائد الفواد (ص ۲۳) سیر الاولیاء (۳۴۸) اور مفتاح العاشقین (ص ۴) میں بھی نظر سے گذری، صرف نام بدلا ہوا ہے فوائد السالکین میں شیخ معین الدین رحمۃ اللہ کا اسم گرامی ہے اور ان تینوں کتابوں میں شیخ شبلی کا نام ہے، ان روایتوں کو دیکھ کر فوائد السالکین کی روایت کو الحاقی سمجھنے سے رجوع کیا اور خیال ہوا کہ متابعت پیر کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کے حلقہ میں اس قسم کی روایتوں کا بیان کرنا عام تھا، گو علمائے ظاہر کی نظر میں یہ کھٹکتی ہیں۔

نومبر ۱۹۶۴ء کے معارف میں جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ میری کتاب بزم صوفیہ میں بھی درج ہے (ص ۶۵۸۔۶۵۹)

اب ذرا فوائد الفواد کی روایت ملاحظہ ہو،

" اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ شیخ کا حکم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے برابر ہوتا ہے، اس وقت یہ حکایت بیان فرمائی کہ ایک روز ایک شخص شیخ شبلی کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا کہ آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں، شیخ شبلی نے فرمایا کہ اس شرط پر تمہاری ارادت قبول کروں گا کہ جو کچھ میں کہوں تم کرو، اس نے کہا کہ ایسا ہی کروں، شیخ شبلی نے کہا کہ کلمہ طیبہ کس طرح پڑھتے ہو، اس نے کہا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، شبلی نے کہا اس طرح کہو لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ، مرید نے اسی طرح کہا، اس کے بعد شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شبلی رسول اللہ کا ایک چاکر کمینہ ہے، میں نے تو صرف تمہارا

امتحان لیا تھا۔ (ص ۲۳۱)

سیرالاولیاء میں بھی یہ روایت دہرائی گئی ہے (ص ۳۳۸) خواجگانِ چشت کے ملفوظات کے تمام مجموعوں میں فوائد الفواد کا مجموعہ بہت ہی مستند سمجھا جاتا ہے، اس کی کسی روایت کو اب تک نہ غیر مستند، نہ الحاقی اور نہ ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے، اسی طرح سیرالاولیاء بھی بہت ہی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زبان سے بیان کی گئی ہے، جن کی پابندیِ شریعت کے متعلق موجودہ دور کے علماء کو بھی پورا اتفاق ہے، ان کے بارہ میں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی ایسی بات کی تعلیم دیتے رہے جو شریعت کے خلاف رہی، مذکورہ بالا روایت علماء کی نظر میں کھٹکتی ہے اور ضرور کھٹکنی چاہئے مگر اس کو کیا کیجئے کہ ایسی روایت صوفیائے کرام کے یہاں رائج رہی اور جب وہ خود کہتے رہے کہ مرید کا صرف امتحان لینا مقصود تھا، ورنہ اصلی کلمہ طیبہ وہی ہے جو رائج ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محض کمترین غلام اور چاکر کمینہ ہیں، تو پھر ان کو ان کے اس حال اور مقام پر چھوڑ دینا چاہئے جہاں سوچ کر وہ اپنے مریدوں کا امتحان لیا کرتے تھے، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہئے ہم ان کے احتساب سے گریز کریں،

ص ع ۔

وفیات

قاضی محمد عدیل عباسی

از

ضیاء الدین اصلاحی

جناب قاضی محمد عدیل عباسی کے انتقال کو کئی مہینے ہوگئے، ادارۂ دارالمصنفین سے ان کو جو اخلاص و تعلق تھا، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے ذکر سے معارف خالی نہ رہے، اس لئے تاخیر کے باوجود اس تحریر کی اشاعت نامناسب نہ ہوگی۔

قاضی محمد عدیل صاحب کا تعلق ضلع بستی کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا، مگر ابتدا ہی سے ان کا رجحان قوم پروری اور حب الوطنی کی تحریک کی جانب ہوگیا تھا، اس لئے کالج کی تعلیم چھوڑ کر وہ عملی سیاست میں داخل ہوگئے، ان کو اس میدان میں پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان وغیرہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، خلافت، ترک موالات اور ہندوستان چھوڑ دو، تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے کی بناء پر وہ کئی بار جیل گئے،

قاضی صاحب کی علمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، ان کا اس کا ذوق کانپور میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کی صحبت میں پیدا ہوا، پھر وہ مشہور قوم پرور اخبار مدینہ بجنور اور زمیندار لاہور سے وابستہ ہوئے، زمیندار اس زمانہ کا سب سے مقبول روزنامہ تھا اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، قاضی صاحب کے قلم سے اس میں ایسے مضامین نکلے جن پر وہ

برطانوی حکومت کے زیرِ عتاب آگئے اور ایک سال تک لاہور سنٹرل جیل میں قید رہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے، ایم۔ اے۔ اور ال۔ ال بی کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۶ء سے بستی میں وکالت شروع کی، اس پیشہ میں بہت نیک نام اور کامیاب تھے، وکالت کے ساتھ ان کو پبلک کے کاموں سے بھی دلچسپی رہی، کئی برس تک بستی میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے، ۱۹۳۷ء میں پہلی دفعہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اور ۱۹۵۷ء تک برابر ممبر منتخب ہوتے رہے، اس کے بعد اس کوچہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا۔

اردو سے ان کو عشق تھا، اس کے لئے وہ عمر بھر جہاد کرتے رہے، آزادی کے بعد جب قومی حکومت نے اس کے ساتھ معاندانہ اور غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا تو وہ اسمبلی کے اندر اور باہر اس کے لئے آئینی و دستوری لڑائی لڑتے رہے، کانگریس میں رہ کر بھی وہ اس کے تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست عناصر سے نبرد آزما رہتے اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ کانگریس کی اردو دشمن پالیسی کی مخالفت کرتے، وہ اردو کی دستخطی مہم میں بھی پیش پیش رہے، اور اس وفد میں شریک ہوئے جس نے صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی قیادت میں اکیس لاکھ افراد کے دستخطوں سے میمورنڈم پیش کیا تھا، اردو کا حق منوانے اور اس کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے ان کی جد و جہد آخر دم تک جاری رہی، اس سلسلہ میں انہوں نے بیشمار مضامین لکھے جن سے اردو تحریک کو بڑی قوت ملی، تیس برس تک وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے بڑے سرگرم اور فعال رکن رہے۔

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی تشکیل و تاسیس قاضی صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے، اس کی بدولت اس صوبہ کے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہو گئے، ان مکاتب کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دین و ایمان کی سلامتی، اسلامی تہذیب و روایات سے انکی وابستگی اور اس کے ذہنی

ارتداد سے محفوظ رہنے کا سامان فراہم ہوا، انھوں نے مکاتب چلانے کے لئے مٹھی فنڈ اور کھلیانی جیسی اسکیمیں چلائیں اور سب سے پہلے اس کا تجربہ اپنے ضلع بستی میں کیا اور جب اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تو انہوں نے پورے صوبہ میں اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے بستی میں دسمبر ۵۹ء میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس کی، جس میں تمام مختلف الخیال اشخاص اور جماعتیں شریک ہوئیں، بعد میں جمعیۃ علمائے ہند نے اس سے علٰحدگی اختیار کر لی لیکن اب بھی اس میں مسلمانوں کی اور دوسری جماعتیں اور مختلف مکاتبِ فکر کے افراد شامل ہیں اور الحمد للہ اس وقت پورے صوبہ میں یہ تحریک کامیابی سے چل رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے، قاضی صاحب کو اس سے بڑا تعلق تھا، وہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور برسوں اس کی کورٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اس کا اقلیتی کردار سلب کیا گیا تو قاضی صاحب کا خواب و خور حرام ہو گیا، اقلیتی کردار کو بحال کرنے کی جد و جہد شروع ہوئی تو وہ اس کے ہراول دستہ میں شامل ہو گئے، اور اس کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جن کا وزن پوری طرح محسوس کیا گیا۔

تصنیف و تالیف قاضی صاحب کا اصلی مشغلہ نہ تھا، لیکن وہ اچھے اہل قلم، ممتاز ادیب و انشا پرداز تھے، قلم برداشتہ لکھنے پر بھی قادر تھے، مضامین کے علاوہ حال ہی میں ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئیں (۱) اقبال فلسفہ حیات و شاعری (۲) تحریکِ خلافت دونوں کتابیں اہم ہیں مگر مؤخر الذکر بعض حیثیتوں سے متنازعہ فیہ ہو گئی ہے، ۱۹۶۸ء میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے گئے تو اس کا سفرنامہ بڑے والہانہ انداز میں لکھا جو کتابی صورت میں چھپا اور پُر از معلومات ہونے کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا، وہ بہت اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے، ان کی تقریریں مربوط، مدلل، مؤثر اور قانونی ہوتی تھیں، دینی تعلیمی کونسل کے جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کے لئے لوگ بہت شوق سے جمع ہو جاتے،

ایک دفعہ اعظم گڑھ کی ضلعی کانفرنس میں انہوں نے دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت ایسے دل نشین انداز میں کی کہ اب تک اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔

وہ دھن اور ارادہ کے پکّے اور عملی آدمی تھے، وہ جس کام میں لگ جاتے اس میں تن، من، دھن سب کی بازی لگا دیتے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اردو اور دینی تعلیمی تحریک کے روح رواں تھے، ان کی سرگرمی اور قوت عمل نے ان تحریکوں میں بڑی حرکت و توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ بہت بے لاگ اور کھرے بھی تھے، حق کے معاملہ میں کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے، جس بات کو غلط سمجھتے اس کی برملا تردید کرتے۔

وہ بڑے قوم پرور تھے، ہندو فرقہ واریت کی طرح مسلم فرقہ واریت سے بھی برد آزما رہتے تھے لیکن ان کا دل دینی حمیت، ایمانی غیرت اور ملی درد سے معمور تھا، نیشنلسٹ مسلمانوں کے طبقہ میں دین و ملت کا ایسا درد رکھنے والے بہت کم لوگ ہوں گے، انھوں نے قوم پروری کو ایمانی و ملی غیرت پر کبھی غالب نہ آنے دیا، انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے، ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ۱۹۶۵ء میں دار المصنفین کی طلائی جوبلی کے ایک جلسہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب افضل اقبال نے انگریزی میں تقریر کی جو عام طور پر پسند کی گئی مگر قاضی صاحب کو اس سے اس بنا پر سخت تکدر ہوا کہ فاضل مقرر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک جس عقیدت و احترام سے لینا چاہیئے تھا نہیں لیا۔ اس کی شکایت انہوں نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین سے بھی کی اور اس کے خلاف قومی آواز لکھنؤ میں مراسلہ بھی لکھا،

انھوں نے کبھی اپنی خدمت کا کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں حاصل کیا بلکہ ہمیشہ ٹھوس اور خاموش خدمت کو نام و نمود پر ترجیح دیا، ان کی موت سے اس دور کا خاتمہ ہو گیا جس میں سیاست داں ملک، قوم اور ملت کی خدمت محض خدمت و ایثار کے جذبہ سے انجام دیتے تھے اور اس میں کسی ذاتی مفاد اور غرض کو دخل نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ قوم و ملت کے اس خدمت گذار کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ کرے۔ آمین!!

مطبوعات جدیدہ

روح القرآن :- مرتبہ مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۴ مجلد قیمت تیس ۳۰ روپیے پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلّی۔

مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم کی ادارت میں تعمیر کے نام سے ایک اخبار "ادارۂ تعلیمات اسلام" لکھنؤ سے برسوں شائع ہوتا رہا، اس میں انہوں نے قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا مفید سلسلہ شروع کیا تھا، جس کو انہوں نے وفات سے قبل کتابی صورت میں مرتب کر کے اشاعت کیلئے مکتبہ جامعہ کو بھیج دیا تھا مگر افسوس یہ جب شائع ہو کر آئی تو خود مولانا کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہو چکا تھا، یہ کتاب سورۂ فاتحہ و بقرہ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے، اردو میں کلام مجید کی متعدد تفسیریں چھپ گئی ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لغت، عربیت اور تفسیر کے دقیق علمی و فنی مباحث سے تعرض کئے بغیر آیتوں کا خلاصہ اور لب لباب پیش کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے عربی سے ناواقف لوگ بھی قرآن مجید کی آیتوں کا اصل مدعا و منشا آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، اس میں طوالت سے پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو اکتاہٹ نہ ہو، زبان سادہ، سلیس، عام فہم اور پیرایۂ بیان دلنشین ہے، اس لئے ہر استعداد کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، سورۂ بقرہ کو ہر جگہ بقر لکھا گیا ہے یہ احتیاط کے خلاف ہے، اس کی قیمت بھی زیادہ ہے، یہ قرآنی خدمت مصنف کی زندگی کی آخری یادگار ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ان کے لئے توشۂ

آخرت بنائے اور اس کے ناشر کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اسلامی تہذیب کے گہوارے مرتبہ جناب خواجہ جمیل احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۷۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے

پتہ :- اردو اکیڈمی سندھ کراچی (پاکستان)

خواجہ جمیل احمد اردو اور انگریزی کے مشہور اہل قلم ہیں اس سے پہلے ان کی انگریزی کتاب "سو بڑے مسلمان" کا ان صفحات میں ذکر ہو چکا ہے، انھوں نے مسلمانوں کے زریں کارناموں کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے، اس کا مقصد ان مغربی مصنفین کا جواب دینا ہے جو ان تمام کمالات کو اپنی جانب منسوب کرتے ہیں جن کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، زیر نظر کتاب میں مسلمانوں کے چھتیس ایسے شہروں اور اہم شہروں کا ذکر ہے جن کو دینی، علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور تاریخی حیثیت سے مرکزیت حاصل تھی، اس کی ابتدا بیت المقدس، مکہ اور مدینہ سے ہوئی ہے پھر عراق و شام کے کوفہ و بصرہ، دمشق و بغداد، مصر و سوڈان کے قاہرہ و خرطوم، مغرب کے قرطبہ و غرناطہ، ترکی کے استنبول (قسطنطنیہ) اور وسط ایشیا کے بخارا اور سمرقند کی قدیم شوکت و عظمت کی داستان بیان کی گئی ہے، ایران کے مرکزی شہروں میں اصفہان، شیراز، نیشاپور اور بلخ وغیرہ کا حال درج ہے، افغانستان، پاکستان، اور ہندوستان کے شہروں میں غزنی، کابل، ٹھٹھ، ملتان، لاہور، ڈھاکہ، دہلی، آگرہ، بدایوں، علی گڑھ، اور لکھنؤ کا ذکر ہے، انڈونیشیا، چین اور شمالی و مغربی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ذکر کر کے ان کے بعض شہروں کی اہمیت و مرکزیت بھی دکھائی ہے، مصنف کی فراخدلی اور وسیع القلبی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل تشیع کے شہروں مشہد، طوس، قاہرہ اور لکھنؤ کے شان و شکوہ اور ان کے خلفاء و سلاطین کی علم و ہنر پروری اور تمدنی و تعمیری کارناموں کا حال بھی بہت دلچسپی سے لکھا ہے، ان کا علم و مطالعہ وسیع ہے، اس لئے اختصار

کے باوجود کسی شہر کی قابل ذکر اور ضروری بات نظر انداز نہیں ہونے پائی ہے، بلکہ ان شہروں میں اسلاف کے کارناموں، امراء و سلاطین کے جاہ و جلال اور مسلمانوں کی علمی، تمدنی اور سیاسی سرگرمیوں کے جو مناظر دیکھے گئے ہیں وہ پوری طرح سامنے آجاتے ہیں اور ان سے متعلق بہت سے اصحاب کمال اور ممتاز اشخاص کی تصویریں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں، اس سے جہاں مسلمانوں اور ان کے فرماں رواؤں کے تدبر، عالی دماغی اور شکوہ و عظمت کا پتہ چلتا ہے وہاں خود مصنف کے ملی جذبہ اور گذشتہ اسلامی روایات سے دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کی بدولت انھوں نے بہت سلیقہ سے مسلمانوں کی قدیم عظمت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے، اگر وہ اسلامی تہذیب کے ان گہواروں کی قدیم خصوصیات کی طرح ان کی موجودہ حالت و کیفیت بھی بیان کر دیتے تو یہ کتاب اور زیادہ مفید ہو جاتی، اس کی تصحیح کی طرف پوری توجہ نہ کرنے سے اشخاص اور کتابوں کے نام غلط چھپے ہیں جیسے فرانزدق (فرزدق) ابو اسود اللہ دلی (ابو الاسود دولی) ابن خلقان (ابن خلکان) سباویہہ (سیبویہ) آل بجیا (آل بویہ) ابو الفراج اصبہانی (ابو الفرج) حکیم (حاکم) معیض ابی دیہ اللہ (المعز لدین اللہ) الحوی (الحاوی) وغیرہ، ایک جگہ بادا کا املا مبادی لکھا ہے، زبان کی بھی بعض غلطیاں ہیں جیسے "کوفہ کو مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود کی صحبت کا شرف رہا" (ص ۴۷) "لیکن بھرا ہو جدید تحقیق کا جس نے مغربی جھوٹ اور فریب کا پردہ چاک کر دیا" (ص ۴۵) پہلے جملہ میں صحبت کے بجائے قیام یا سکونت اور دوسرے میں بُرا کی جگہ بھلا لکھنا چاہئے تھا۔

مسعود حسن ادیب مرتبہ جناب سبط محمد نقوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے، پتے (۱) کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ (۲) دانش محل، امین آباد لکھنؤ،

یہ کتاب اردو کے مشہور محقق و مصنف پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے حالات و کمالات کا مرقع ہے جو متعدد اہل قلم کی نگارشات پر مشتمل ہے، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور خواجہ احمد فاروقی کے مضامین تاثراتی ہیں، نیر مسعود اور اظہر مسعود نے بالترتیب اپنے والد کے مختصر سوانح اور مرض الموت کے حالات تحریر کئے ہیں، دوسرے مضامین میں مسعود صاحب کی ادبی و تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، لائق مرتب نے ادیب صاحب کو تیری محقق اور مجاہد اُردو ثابت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسعود حسن صاحب کی اُردو زبان سے عشق و محبت کا حال لکھا ہے اور اُردو اور اس کے رسم الخط کے متعلق ان کی مساعی کا ذکر کیا ہے، مضمون نگار نے اُردو شاعری خصوصاً غزل اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کے دفاع میں ادیب صاحب کا نقطۂ نظر مدلل طور پر پیش کیا ہے لیکن اس کے ضمن میں حالیؔ اور ان کے مقدمۂ شعر و شاعری کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مقطع کی سخن گسترانہ بات ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں وہ خطوط بھی درج ہیں جو مسعود حسن صاحب نے پروفیسر سید حسن (پٹنہ) اور لائق مرتب کو وقتاً فوقتاً تحقیقی و ادبی امور کے متعلق تحریر کئے تھے، آخر میں چند منظومات و قطعات بھی ہیں لائق مرتب نے محض مضامین کی جمع و ترتیب پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کو مفید و معلوماتی حواشی سے بھی مزین کیا ہے۔ لیکن خود ان ہی کے بقول "حاشیہ آرائی ذرا مبالغے کے ساتھ ہوگئی ہے" حالانکہ حاشیہ آرائی محض وضاحت طلب امور ہی کے بارہ میں ہوتی ہے، تاہم ان حواشی سے یہ کتاب وزنی ہوگئی ہے فاضل مرتب کو تحریر و تصنیف کا اچھا تجربہ و سلیقہ ہے، علاوہ ازیں وہ مسعود حسن رضوی کے بڑے عقیدت مند اور قدر داں ہیں۔ اس لئے انہوں نے یہ کتاب بڑے ذوق و شوق سے مرتب کی ہے، امید ہے کہ یہ ذوق و شوق سے پڑھی بھی جائے گی،

"ض"